رجسٹرڈ نمبر اے ۱۱۰۴

نگار

قواعد رسالہ "نگار"

۱- رسالہ ہر مہینے کی پندرہ تاریخ سے پہلے شایع ہوتا ہے۔
۲- رسالہ نہ پہونچنے کی صورت میں بیس تاریخ تک دفتر کو اطلاع ہونی چاہیئے ورنہ رسالہ مفت نہ روانہ کیا جائیگا
۳- خط کتابت کیوقت اپنا نمبر خریداری ضرور لکھیے جسپر نمبر خریداری نہیں ہوتا ایسے خطوط ضایع کردیئے جاتے ہیں
۴- جواب طلب امور کے لئے جوابی کارڈ یا ٹکٹ آنا ضروری ہے۔
۵- مضامین صاف اور خوشخط آنے چاہییں۔
۶- سالانہ قیمت پانچ روپیہ، ششماہی تین روپیہ۔ بیرون ہند سات روپیہ سالانہ پیشگی مقرر ہے۔

نرخنامہ اجرت اشتہارات

تعداد صفحہ	ایک صفحہ	نصف صفحہ	پاؤ صفحہ
بارہ مرتبہ	۱۰۰ روپیہ	۶۰ روپیہ	۴۰ روپیہ
چھ مرتبہ	۶۰ روپیہ	۳۵ روپیہ	۲۵ روپیہ

(۱) اجرت ہر حال میں پیشگی آنا ضروری ہے (۲) جو صاحبان تین ماہ سے زائد اشتہار دیں گے ان کو بیس فیصدی کمیشن دیا جائیگا میعاد اشتہار کے اندر دو مہینے قبل اطلاع دینے پر مضمون بدل سکتا ہے۔

تعداد صفحہ	ایک صفحہ	نصف صفحہ	پاؤ صفحہ
تین مرتبہ	۳۵ روپیہ	۲۴ روپیہ	۱۴ روپیہ
ایک مرتبہ	۱۲ روپیہ	۹ روپیہ	۶ روپیہ

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

چوتھائی قیمت پیشگی لازم ہے

مولانا نذیر احمد
- نبات النعش ۹ر
- مراۃ العروس ۱۰ر
- توبۃ النصوح ۱۲ر
- موعظہ حسنہ عہ
- رویائے صادقہ عہ
- ایامی عہ
- فسانۂ مبتلا عہ
- ابن الوقت عہ
- مصائب غدر ۱۲ر

مولانا شبلی
- سیرۃ النبی جلد اول عہ
- // دوم ۸ر
- // سوم عہ
- الفاروق عار
- سیرۃ النعمان ۸ر
- الغزالی ۸ر
- المامون عہ
- سوانح مولانا روم عار
- سفرنامہ مصر و شام عار
- علم الکلام عار
- الکلام عار
- رسائل شبلی ۸ر
- مقالات شبلی عہ
- شعر العجم جلد اول ے
- // دوم عار
- // سوم عار
- // چہارم ے
- // پنجم عار
- موازنہ انیس و دبیر ے
- مضامین عالمگیر ۸ر
- آغاز اسلام ۸ر
- کلیات فارسی عار
- کلام شبلی اردو ۸ر

امیر مینائی
- صنم خانۂ عشق عار
- مراۃ الغیب ۸ر
- محامد خاتم النبیین ۸ر
- منیائے سخن عہ
- مکاتیب امیر مینائی عار

رتن ناتھ سرشار
- سیر کہسار ۸ر
- خدائی فوجدار عار
- جام سرشار عار
- الف لیلہ بطرز ناول ۸ر
- کامنی ۸ر
- سوانح عمر عیار ۸ر
- پیاری دنیا ۸ر
- کایا پلٹ ۸ر
- میٹھی چھری ۶ر
- طرحدار لونڈی عہ
- طلسمی فانوس ۱۲ر

منشی سجاد حسین مرحوم
- احمق الذی ۸ر
- حاجی بغلول ۸ر

جوالا پرشاد برق
- مرنالنی ۱۲ر
- مار آستین ۱۲ر
- بنگالی دلہن ۱۲ر
- معشوقۂ فرنگ ۱۲ر

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۰۴۴ — جلد ۱۵ - شمارہ ۳

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فرخ بنارسی ۸۲
اکبر حیدری ۸۳
طالب باغپتی ۸۴
اختر شیرانی ۸۵
امین حزیں ۸۶
محمود الہ آبادی ۸۷
حافظ غازیپوری ۸۸
———— ۸۹
———— ۹۴

فضائے بسیط اور ہم — اخگر مرادآبادی ۷۸

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نگار

اڈیٹر: نیاز فتحپوری

جلد ۱۵ | مارچ ۱۹۲۹ء | شمار ۳

ملاحظات

اگر غور کیا جائے تو یہ بات آسانی سے معلوم ہو سکتی ہے کہ حکومت زیادہ سے زیادہ چار قسموں کی ہو سکتی ہے:۔ ایک شخصی واستبدادی ملوکیت جسمیں قوم کی رائے اور اسکی آواز کو کوئی دخل نہیں ہے اور شاہِ وقت ملک کے سیاہ و سفید کا مختارِ کُل ہوتا ہے اس قسم کی حکومتیں انیسویں صدی سے قبل اکثر جگہ پائی جاتی تھیں اور کچھ زمانہ پیشتر روس ترکی و ایران میں بھی یہی "سلطنۃ مطلقہ" پائی جاتی تھی، لیکن اب سوائے سیام اور بعض ہندوستانی ریاستوں کے، یہ طریق حکومت تمام دنیا سے معدوم ہو گیا ہے اور اس کے حیلہ کی اب کوئی امید بھی نہیں۔

دوسری قسم حکومت کی حکومت جمہوری دیمقراطی ہے جو قوم اور نمایندگان قوم کے زیر اثر ہوتی ہے اور کسی ایک شخص کو اختیار کامل نہیں دیا جاتا جس کی ایک مثال فرانس کی حکومت ہے تیسری قسم کی حکومت وہ ہے جسے حکومت اتحادی کہتے ہیں، جمہوری اور اتحادی حکومت میں یہ فرق ہے کہ اول الذکر میں صرف ایک مخصوص قوم و جماعت تمام اہل ملک کے لئے وضع قانون کا اختیار رکھتی ہے (مثلاً ملک فرانس کہ وہاں کا ہر شخص خواہ وہ کسی جگہ کا رہنے والا ہو پیرس کی پارلیمنٹ کے وضع کردہ قوانین کے آگے سر جھکا دیگا) اور موخر الذکر طریق حکومت میں ایک ملک کے مختلف حصے اپنے اپنے مفاد کے لحاظ سے مختلف قوانین وضع کرتے ہیں

اور انکا تعلق ایک مرکزی حصہ سے ہوتا ہے جس کو یہ مختلف حصے کچھ زاید حقوق دیدیتے ہیں۔ اسکی مثال میں امریکہ، سوئٹزرلینڈ اور جرمنی کو پیش کیا جا سکتا ہے۔

چوتھی قسم حکومت کی سوویٹ ہے یعنی وہ جواب رُوس میں پائی جاتی ہے اور مجالس عمّال پر قایم ہے۔ یہ تو صرف وہ تقسیم ہے جسے عقل بھی تسلیم کرتی ہے اور جو عملاً بھی اس وقت دنیا میں پائی جاتی ہے، لیکن ایک پانچویں قسم حکومت کی اور ہے، جو اپنے وجود کی اہمیت اور عمل کی وسعت کے لحاظ سے ساری دنیا پر چھائی ہوئی ہے، لیکن عقل حیران ہے کہ اس کو کیا سمجھے، آپ نے اگر کبھی غور کیا ہوگا تو آپ بھی شاید حیران ہوئے ہونگے کہ حکومت برطانیہ کو کس نوع کی حکومت میں شامل کرنا چاہئے اور اسکے متضاد عناصر کو دیکھتے ہوئے اسکا کیا نام رکھنا چاہئے۔ وہاں ملوکیت بھی ہے لیکن ناقص و ناکمل، وہاں دستوریت بھی ہے لیکن محدود و مقید، وہاں دیمقراطیت (Democracy) بھی ہے مگر لایعنی و بیکار، اور وہاں ارستقراطیت (Aristocracy) بھی ہے لیکن لغو و بے معنی۔ پھر اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہندوستان، جسکی نجات و ہلاکت کا تنہا ذمہ دار اب گاندھی اور نہرو نے بھی حکومت برطانیہ کو تسلیم کر لیا ہے، اس سے کس نوع کی حکومت کا مطالبہ کر سکتا ہے، اور ایسا نظام حکومت اسے کیا عطا کر سکتا ہے مطالبہ کی صورت ہمارے سامنے نہرو رپورٹ کی شکل میں موجود ہے جو عطا ہونیوالا ہے۔ اسکا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جناب سائمن ہمارے حال کی تفتیش کے لئے مامور ہوئے ہیں جن کو کونسل و ملک کے لحاظ سے بعید ترین تعلق بھی ہندوستان سے نہیں ہے۔

ڈومی نین ہوم رول، کوئی الہامی فقرہ نہیں، جس کے دنیا میں صرف ایک ہی معنی لئے جا سکیں، اس لئے یہ ضروری نہیں کہ ہندوستان کے ڈومی نین ہوم رول کے بھی وہی معنے ہوں جو کناڈا یا آئرلینڈ کے ہوم رول کے ہیں اور اگر وہی ہوں، تو بھی یہ لازم نہیں کہ برطانیہ اسی اصول پر ہمارا خط سرشت تحریر کر دے، جبکہ وہ خود نوعیت حکومت کے لحاظ سے ایک نہایت ہی عجیب و غریب مجموعہ اضداد و مناقضات کا ہے۔

نہرو رپورٹ میں جس نوع کی حکومت ہندوستان کے لئے طلب کیگئی ہے وہ یقیناً کسی خوددار قوم کے لئے باعث فخر و ناز نہیں ہو سکتی اور نہ اس سے کسی قوم کی عالی حوصلگی کا پتہ چلتا ہے، لیکن ادھر برطانیہ کی پیچیدہ پالیسی اور عجیب طرز حکومت کو دیکھتے ہوئے اور ادھر خود سرزمین ہند میں بسنے والی دیوانۂ مذہب قوموں کے اختلاف آرا پر نگاہ ڈالتے ہوئے، جو کچھ طلب کیا گیا وہ بڑی حد تک سب کو ایک مرکز پر لانے کا امکان اپنے اندر رکھتا تھا، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ برطانیہ کا اقبال یہاں بھی کام کر گیا اور مسلمانوں کی ایک جماعت نے، جسکی نیت سے بحث کرنیکی ضرورت نہیں، نہرو رپورٹ سے اختلاف کر کے ایک ایسا عذر لنگ نہیں بلکہ صحیح الہ کار اس کے ہاتھ میں دیدیا کہ اگر دسمبر ۲۹ء کیا معنے دسمبر ۳۹ء تک بھی حکومت آرام سے سوتی رہے تو گاندھی کو اپنے الٹی میٹم کے مطابق عمل کرنیکی کوئی عقلی دلیل میسر نہیں آ سکتی۔ اس لئے مستقبل میرے سامنے ہے اور میں دیکھ رہا ہوں کہ وہ وقت آئے گا جب نہرو رپورٹ اساطیر الاولین میں داخل ہو جائے گی اور کوئی اور خدا کا بندہ دوسری رپورٹ طیار کریگا اور اسوقت بھی یہی سوال پیدا ہوگا کہ ہم برطانیہ سے کیا طلب کریں اور وہ ہمیں کیا دے سکتا ہے جبکہ نہ اسکے پاس کچھ دینے کو ہے اور نہ ہم لینے کے اہل۔

یقیناً ایک قوم کی یہ بڑی بے مائگی ہے کہ اسیر غیروں کی حکومت ہو، لیکن ایک درجہ اس سے بھی فروتر ہے اور وہ یہ کہ وہ غیروں کی حکومت کی محتاج ہو، اور اس سے نظم و عدل کی اہلیت سلب کر لی گئی ہو۔ پھر جس وقت تک ہم اس منزل میں ہیں نہ نہرو رپورٹ سے کچھ کام نکل سکتا ہے، نہ عدم تعاون کے الٹی میٹم سے اور نہ مسٹر پٹیل کے ہاں اجتماع ارون و گاندھی سے۔

جس وقت تک مسلمان (نزاع کفر و ایمان کے نقطۂ نظر سے) مسلمان، اور ہندو (اپنی گوسالہ پرستی اور چھوت چھات کے اعتبار سے) ہندو ہے، ہندوستان کبھی غلامی کی لعنت سے نہیں نکل سکتا اور نہ اس کو نکلنا چاہئے۔ اس قعر میں جس طرح مسلمان مبتلا ہیں بالکل اسی طرح ہندو بھی گرفتار ہیں، نہ انکی نگاہ وسیع، نہ انکا سینہ فراخ اور جبتک دونوں میں سے ہر ایک اپنی اپنی جگہ صرف اپنے ہی کو نجات اخروی اور ملکی کا اہل سمجھتا ہے اس وقت تک کوئی امید فلاح کی نہیں ہے۔

اس لئے جس وقت میں یہ دیکھتا ہوں کہ بعض اکابر قوم بجائے اس کے کہ ان کے ذہن میں وسعت اور دماغ میں اخوت عامہ قایم کرنیکا خیال پیدا ہو، روز بروز تنگ نظر اور رسم و رواج کے پابند ہوتے جاتے ہیں تو میری یاس کی کوئی انتہا نہیں رہتی اور مجھ کو خود اپنی ذات سے نفرت ہونے لگتی ہے کہ میں کیوں نہ بجائے مسلمان ہونے کے انسان پیدا ہوا۔ پس اگر ہندو مسلمان چاہتے ہیں کہ صحیح معنے میں باہم اتحاد پیدا ہو تو انکا اولین فرض یہ ہے کہ وہ تمام ان نقوش کو قلب سے محو کردیں جنسے بوئے عصبیت آتی ہے ورنہ جب تک ہندو یونیورسٹی کا نام ہندو یونیورسٹی، مسلم یونیورسٹی کا نام مسلم یونیورسٹی ہے جب تک ہندو چوٹی میں گرفتار ہے اور مسلمان اپنی ریش دراز میں، اور جس وقت تک مذہب کا مفہوم اخوت عامہ اور انسانیت پرستی نہیں ہو جاتا، نہ ہندوستان کبھی آزاد ہو سکتا ہے اور نہ حریت کی صحیح روح پیدا ہو سکتی ہے۔

آزادی نام ایک کیفیت کا ہے جو پہلے قلب انسانی میں خود اس کے آزادی ضمیر کے ساتھ پیدا ہوتی ہے اور وہ علائق مذہب و ملت سے بہت بلند ہے۔ اگر آج ہندوستان موجودہ ذہنیت کے ساتھ آزاد و خود مختار ہو جائے تو بھی ہمارے لئے باعث مسرت نہیں، کیونکہ وہ امن و سکون جو آزادی کے بعد حاصل ہوتا ہے اس وقت تک میسر نہیں آسکتا جب تک ہماری روحیں آزاد نہ ہوں، ہمارے خیالات وسیع نہ ہوں اور تفریق ملت، امتیاز کفر و اسلام کا پردہ درمیان سے نہ اٹھ جائے اور یہ امکان نہیں جب تک مذہب مفقود نہ ہو جائے، یا لوگ مذہب کے صحیح مفہوم سے آشنا نہوں اور اسکو انفرادی عقیدہ کی چیز جانکر اجتماعیات سے علحدہ نہ رکھیں۔

ہندو مسلمانوں کے جتنے اکابر آج آزادی کے لئے جد و جہد کر رہے ہیں وہ سب بلا استثناء یہ اہلیت اپنے اندر نہیں رکھتے اور جس وقت کورانہ تقلید اور قدامت پرستی کا سوال آتا ہے تو گاندھی ایسا انسان بھی گاؤ پرستی کے احمقانہ جذبہ سے متاثر ہو کر ملک کے تمام مصالح قربان کرنے کیلئے آمادہ ہو جاتا ہے اور بڑے سے بڑے ذی ہوش مسلمان لیڈر کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ سرے سے قربانی کرنا کونسا محمود فعل ہے کہ گائے اور بکری میں انتخاب کا سوال پیدا ہو۔

افغانستان کا مسئلہ بدستور الجھا ہوا پڑا ہے اور اسوقت تک واقعات نے کوئی خاص رُخ ایسا اختیار نہیں کیا، جنکی بنا پر
صحیح رائے قایم ہوسکے۔ امیر امان اللہ خاں بدستور قندھار میں ہیں۔ بچہ سقہ اسی طرح کابل میں موجود ہے۔ سردار علی احمد جان
ر کابل جو اس درمیان میں خود عویدار سلطنت ہوکر اٹھے تھے، پھر امیر امان اللہ خاں کے طرفدار ہوگئے ہیں اور جنرل نادر خاں
آمد کا سخت انتظار تھا آگئے ہیں، اور نہیں کہا جاسکتا کہ وہ کیا کرنا چاہتے ہیں اور کیا کرسکیں گے۔

جنرل نادر خاں کا افغانستان میں بہت اثر ہے، اس کو وہ خود بھی جانتے ہیں اس لئے قدرتاً انکو اسکا خیال کرنا چاہئے
ں کوئی امر انکی اس اثر کو کم کرنیوالا نہ پیدا ہوجائے اور یہی سبب ہے کہ اسوقت تک وہ کوئی رائے قایم نہیں کرسکے کہ
ینگے، تاہم اسقدر ضرور معلوم ہوا ہے کہ وہ پہلے جلال آباد جاکر وہاں کے قبایل کو جمع کرکے معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ ان کا
یال ہے اور پھر اتفاق آرا سے کسی بادشاہ کا انتخاب کرینگے۔ گویا وہ اس وقت نہ امیر امان اللہ خاں کے طرفدار ہیں اور نہ مخالف
ں سوال یہ ہے کہ آیا جنرل نادر خاں کا موجودہ طرزِ عمل وہاں کے حالات کے لحاظ سے مناسب ہے یا نہیں اور اگر انتخاب حکمراں کا
ں قبایل نے امیر امان اللہ خاں کے خلاف کیا تو جنرل نادر خاں اُن قبایل کے ہم آہنگ ہوکر کامیاب ہوسکیں گے یا نہیں۔

یہ بالکل کھلی ہوئی بات ہے کہ افغانستان میں ابھی دستوری یا جمہوری حکومت قایم نہیں ہوسکتی وہ اس منزل سے
پیچھے ہے۔ اس لئے وہاں کسی نہ کسی خود مختار حکمراں کا ہونا ضروری ہے، لیکن ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ امیر امان اللہ خاں کے
ہوتے ہوئے یعنی اک جائز و اہل حکمراں کی موجودگی میں انتخاب حکمراں کے سوال کا پیدا ہونا کیا معنے رکھتا ہے۔ نادر خاں کا اپنی قطعی
ظاہر کرنے سے انکار، کسی نتیجہ پر پہونچنے میں پس و پیش اور اگر خبریں صحیح وصول ہوتی ہیں تو انکا قندھار جانے سے باوجود طلب کرنے کے
کرنا، پوری طرح اس خیال کی تصدیق کرتا ہے کہ وہ امیر امان اللہ خاں کے طرفدار ہوکر نہیں آئے اور افغانستان کی موجودہ
یوں کو وہ امیر امان اللہ خاں کے نقطۂ نظر سے دور کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ افغانی قوم نہایت کینہ پرور
ہے۔ لیکن تعلیمیافتہ طبقہ میں تو اس قومی خصوصیت کو بہت ضعیف ہوجانا چاہئے، اگر جنرل نادر خاں نے بیماری کی حالت
یورپ سے افغانستان کا سفر برداشت کرنے کی زحمت کسی انتقام طلبی یا کینہ پروری کی بنا پر اختیار نہیں کی ہے جبکا
ں ہے، تو پھر اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ جنرل نادر خاں صرف ایک پتلی ہیں جسکا رشتہ کسی غیر ملکی ہاتھ میں ہے اور
کی جنبش پر ان کی نقل و حرکت کا انحصار ہے۔ بہرحال اسوقت تک تمام معاملات پر نگاہ ڈالنے سے یہ امر تو یقینی
پر تحقق ہوچکا ہے اور وہ یہ کہ بچہ سقہ افغانستان کا فرمانروا نہیں رہ سکتا، اس لئے اب صرف یہ دیکھنا ہے کہ آئندہ امیر
اللہ خاں کے سر پر تاج شاہی رکھا جاتا ہے یا کسی اور کے، جنرل نادر خاں اور ان کے بھائی اس کا اعلان کرچکے
ور وہ تخت و تاج کی تمنا نہیں رکھتے، سردار علی احمد جان کے سر سے بھی یہ سودا نکل چکا ہے، اس لئے بظاہر منطقی نتیجہ
نکلتا ہے کہ سوائے امیر امان اللہ خاں کے اور کوئی افغانستان کی عنان حکومت اپنے ہاتھ میں نہیں لے سکتا لیکن اندرونی
دگیاں اور بیرونی سیاسی ریشہ دوانیاں اسقدر گہری نظر آتی ہیں کہ یہ سب کچھ آسانی سے حاصل ہوتا ہوا نظر نہیں آتا۔

اگر امیر امان اللہ خاں کی اس تقریر پر نگاہ ڈالی جائے جو انہوں نے پشاور میں ایک جماعت کے سامنے کی تھی، تو اس سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ اس انقلاب میں بعض وزرائے کابل کی غداری بھی اپنا کام کر رہی تھی (جیسا کہ اس سے قبل بھی ہم نگار میں ظاہر کر چکے ہیں) اور اس لئے آگ لگانے والے نے یہ آگ باہر سے نہیں لگائی تھی، بلکہ اندر سے بھی اس پر تیل چھڑکنے کا کافی انتظام کر لیا تھا۔

ایک قزاق کا اس قدر قوت حاصل کر لینا کہ وہ مستقل حکومت کی بنیاد کو ہلا ڈالے، ایک ایسی کھلی ہوئی داستان مکر و سازش اپنے اندر پنہاں رکھتی ہے جس کے سمجھنے کیلئے زیادہ غور و تامل کی ضرورت نہیں اور اس کا جواب اگر کوئی ہو سکتا ہے تو صرف یہ کہ امیر امان اللہ خاں بغیر وساطت نادر خاں کے اپنی ضرورت ملک سے تسلیم کرالیں اور اگر جنرل نادر خاں کے فیصلہ ہی پر انحصار ہونے والا ہو تو اس کے ماننے سے انکار کر دیں اور بجائے بادشاہ ہونے کے آزاد انسان کی زندگی کو ترجیح دیں۔

بہر حال امید کی جاتی ہے کہ اپریل تک ادھر یا ادھر کوئی فیصلہ ہو جائے گا اور اگر یہ چنگاری گذشتہ جنگ عظیم کی سرویا کی سی چنگاری ثابت نہ ہوئی تو نہ برطانیہ کو اپنی غیر جانبداری توڑنے کی ضرورت ہوگی اور نہ روس کو فوجی نقل و حرکت کی۔

اس وقت جمہوریہ ترکی کی توجہ کا مرکز ملک کی تعلیم عام ہے۔ اب سے چار سال قبل اس باب میں سب سے پہلا دانشمندانہ قدم یہ اٹھایا گیا تھا کہ قدیم مذہبی مدارس کو فنا کر دیا گیا، کیونکہ غازی مصطفےٰ کمال اس امر کو اچھی طرح جان گئے تھے کہ ملک کی ترقی کا سب سے بڑا مانع علماء کا وہ گروہ ہے جو اس وقت ہاتھ کی چھٹی انگلی کی طرح بیکار ہونے کے ساتھ ہی بدنما بھی ہے اور ملک میں اس نوع کی پیداوار کو جاری رکھنا گویا خود بیماری کے جراثیم منتشر کرنا تھا، اس لئے انہوں نے ان مدارس ہی کو بند کر دیا جس سے یہ موذی جماعت بڑھتی جا رہی تھی، اور ملک کو انحطاط کی طرف ڈھکیل رہی تھی، لیکن اس کے بعد ملک کی دیگر ضروریات کی وجہ سے کوئی دوسرا قدم اصلاحات کی طرف نہیں اٹھایا جا سکا تھا۔

اس وقت وہاں کا نظام تعلیم یہ تھا کہ ہر صوبہ میں علیحدہ تعلیم کا بجٹ مقرر کیا جاتا تھا اور اس کی ساری ذمہ داری صوبہ کی حکومت پر ہوتی تھی، لیکن اب اس دستور کو مٹا کر صرف ایک مرکزی بجٹ سارے ملک کے لئے مقرر کر کے انگورہ سے متعلق رکھا گیا تاکہ تعلیم کا انتظام قلب حکومت سے وابستہ رہے اور اسپر زیادہ توجہ صرف کیجا سکے

اس وقت وہاں ۶۰۰۰ ابتدائی مدارس ہیں جن میں ۳۴۰۰۰ طلبہ تعلیم پاتے ہیں۔ ۱۹ ثانوی مدارس ہیں جہاں ۷۴۰۰ طلبہ رہتے ہیں، ۲۳ مدارس مدرسوں کے لئے ہیں جہاں خاص طور پر زراعت و تجارت وغیرہ کی بھی تعلیم ہوتی ہے۔ انمیں ۵۲۰۰ طلبہ پائے جاتے ہیں۔ یونیورسٹی صرف ایک ہے۔ غیر ملکی مدارس کی تعداد ۲۰۰ جہاں ۲۶۰۰۰ طلبہ پڑھتے ہیں۔ ان اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں ابھی بہت زیادہ مدارس قائم کرنے کی ضرورت ہے اور اسی لئے اس شعبہ کو مرکزی حکومت نے اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے اور امسال وہاں صرف قسطنطنیہ میں ۶۴ جدید ابتدائی مدارس تعمیر کئے جا رہے ہیں تاکہ ملک کے بڑھے ہوئے شوق تعلیم کو پورا کیا جا سکے۔

جب سے وہاں لاطینی خط کا رواج ہوا ہے، سارے ملک میں تعلیم کی طرف سے عجیب و غریب شوق پیدا ہو گیا ہے
ں آسانی کو دیکھتے ہوئے جو اس جدید خط کی وجہ سے پڑھنے میں پیدا ہو گئی ہے، طلبہ اسقدر کثرت سے آنے لگے ہیں کہ موجودہ
کے لئے بالکل ناکافی نظر آتے ہیں۔ بہر حال اس وقت ترکی جس خوبی کے ساتھ ترقی کی طرف مایل ہے، اسکا اعتراف
ے قدیم رنگ کے مولویوں کے سبھوں نے کیا ہے اور اگر ایک ربع صدی تک انکی یہی حالت رہی تو ممکن ہے کہ ملک
عنصر ہی سے پاک ہو جائے جس کی طرف سے اندیشہ مخالفت کا کیا جاتا ہے۔

کانگرس کے پروگرام میں بدیسی کپڑوں کے مقاطعہ کی طرف عملی قدم اٹھایا گیا ہے، جس کی بہت مبارک ابتدا گاندھی
ی گرفتاری سے ہوئی۔ ہر چند یہ گرفتاری صرف اس بنا پر ہوئی تھی کہ کلکتہ کے مقامی قانون کی رو سے آبادی کے
سی ڈھیر میں آگ لگانا ممنوع ہے اور بدیسی کپڑوں کے اندر جہاں آگ لگائی گئی تھی وہ آبادی ہی کے اندر تھا، لیکن
تصادم ہمیشہ جذبات میں اشتعال پیدا کرتا ہے، اس لئے جو کچھ ہوا برا نہ ہوا اب دیکھنا یہ ہے کہ برما سے واپسی کے بعد
ی جی اس مقدمہ کی جوابدہی کرتے ہیں یا نہیں اور ان کو اس جرم کی سزا بھی ملتی ہے یا نہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ گورنمنٹ
مقدمہ کو اٹھا لیگی اور چلانا مناسب نہ سمجھے گی، لیکن اگر ایسا نہ کیا گیا تو قدرتاً اس تحریک کو مدد ملنا چاہئے اور زیادہ قوت
ساتھ اس تحریک کو قایم رہنا چاہئے۔ مگر اسی کے ساتھ یہ خیال رکھنا ضروری ہے کہ اگر مقامی حکومتیں زیادہ صبر و ضبط
کام نہیں لے سکتیں تو ہم کو دامن اعتدال ہاتھ سے نہ دینا چاہئے اور جو کچھ کریں اس کو انتہائی امن و سکون کے ساتھ
چاہئے، قانون شکنی کی صرف یہی ایک صورت نہیں ہوتی کہ اس کی مخالفت کی جائے، بلکہ اسکی بہترین صورت یہ ہوتی
کہ اس کے استعمال کا موقعہ ہی نہ دیا جائے، قانون جرم کرنے سے بیکار نہیں ہوتا بلکہ ترک جرم سے۔

مسلم لیگ کی دونوں مخالف جماعتوں کا اجلاس جو حال ہی میں ہوا ہے اور جسمیں باہم مفاہمت و مشارکت کی سعی کیگئی
نہایت مبارک خیال ہے۔ جو راہ عمل اب اختیار کیگئی ہے، اس کو اس سے قبل ہی اختیار کرنا چاہئے تھا، لیکن "بعد از خرابی بسیار"
صحیح راستہ کو اختیار کرنا ہمارے اکابر ملت کی خصوصیت ہے۔

اس اجلاس میں مولانا محمد علی نے جو طریق عمل و انداز گفتگو اختیار کیا، وہ انسانی نفسیات کا کوئی اہم راز نہیں ہے۔ اس
ان میں نہرو رپورٹ کی مخالفت اور اجلاس کلکتہ میں ان کی غیر مدبرانہ تقریر نے (جیسا کہ ہمیشہ ہوا ہے) انکی سیادت و قیادت
یا سخت صدمہ پہونچایا کہ اس وقت تک باوجود کوشش کے اس کی تلافی نہ ہو سکی۔ اس کے بعد افغانستان کے معاملہ
ں انکے خیالات و آراء نے جس غیر دانشمندانہ ذہنیت کا ثبوت دیا، اس نے اور بھی رہے سہے وقار کو کھو دیا، اس لئے ان کو قدرتاً
ین ہونا چاہئے تھا اور یہ دیکھ کر کہ علیحدہ وہ کوئی جماعت اپنی پیدا نہیں کر سکتے، ان میں فطری طور سے یہ خواہش پیدا ہونا

چاہئے تھی کہ کسی طرح پھر اس جماعت میں داخل ہو جائیں جس سے وہ علیحدہ ہو گئے تھے۔ چنانچہ یہی وہ جذبہ تھا جس کے ماتحت انہوں نے محمد علی جناح کے ہم آہنگ ہو کر کہدیا کہ اگر مسلمانوں کا مفاد محفوظ رہے تو وہ مخلوط انتخاب کے موافق ہیں حالانکہ اب سے قبل یہیں دہلی کے کانفرنس میں جس کی صدارت سر آغا خاں نے کی تھی، یہ امر مولانا محمد علی کی کوشش ہی سے طے پایا تھا کہ انتخاب جداگانہ لازم ہے۔

بہرحال ہم خوش ہیں کہ انہوں نے اپنی غلطی کا اعتراف صراحۃً نہیں تو کنایۃً کر لیا، لیکن آیندہ کے لئے بھی انکو اچھی طرح جان لینا چاہئے کہ ہر چیز کی ایک عمر ہوا کرتی ہے اور غالباً انکی سیادت بھی اب عالم شیب ہی کی گھڑیاں بسر کر رہی ہے اور دنیا کو اسکی زیادہ پرواہ نہیں ہے۔

اس ماہ کا رسالہ چار پانچ دن کی تعویق سے شایع ہو رہا ہے، جس کا ایک ضعیف سبب تو فروری کے مہینہ کا اختصار تھا اور دوسرا قوی سبب یہ کہ نگار کے جدید کاتب جو ضرورت سے زیادہ متقی واقع ہوئے ہیں، ماہ رمضان کیوجہ سے کافی وقت نہ دے سکے اور اس طرح اس ماہ کے نگار کو اپنی پابندی بطور خراج ان کے زہد و ورع کے حضور میں پیش کرنی پڑی اور چونکہ میں پابند صیام نہیں ہوں اس لئے میں نے بھی یہ کفارہ دینا آسانی سے گوارا کر لیا۔

حامد رضا خاں تبسم نظامی جو نمایندۂ نگار کی حیثیت سے کام کر رہے تھے بعض اسباب کی بنا پر جنکے اظہار کی فی الحال ضرورت نہیں، اپنی خدمت سے معزول کر دیئے گئے ہیں اور اب دفتر نگار سے انکا کوئی تعلق قایم نہیں رہا، اس لئے اگر کسی صاحب نے انکو کوئی رقم نگار کے متعلق مرحمت فرمائی تو اس ذمہ دار دفتر نگار نہ ہوگا۔

اس درمیان میں بعض چیزیں علاوہ کتابوں کے اور بھی ریویو کیلئے آئی ہیں جنمیں خصوصیت کیساتھ ایک کا ذکر یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے۔ یہ ایک تیل ہے جسکے متعلق مخترع کا دعویٰ ہے کہ خواہ کسی سبب سے سر کے بال گر جائیں، اسکے استعمال سے پھر پیدا ہو جاتے ہیں، میں نے خود اپنے ایک عزیز دوست کو یہ شیشی استعمال کیلئے دی اور میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ انکا وہی سر جو بالکل ہتھیلی کیطرح صاف تھا ایک ہی شیشی کے استعمال کے بعد خوشنما گھنے بالوں سے بالکل ڈھک گیا۔ تقویت دماغ اور تقویت بصارت کی بھی انہوں نے تصدیق کی۔

اگر کسی صاحب کو مزید حالات معلوم کرنا ہوں تو ذیل کے پتہ سے خط و کتابت کریں۔

سخاوت حسین۔ ذریعہ سید احمد حسین صاحب پیرمل لکھنؤ

نیاز فتحپوری

ورنگل کے آثار قدیمہ

ہر قوم کے آثار گویا مرآۃ تاریخ ہوتے ہیں۔ کیونکہ اس سے ان کے کردار کا جس قدر تعلق رہا ہے، اور اس کے ذریعہ سے انکے سمجھنے میں جسقدر سہولت و آسانی ہوتی ہے۔ وہ اصل میں انہی کے اس جستہ جستہ آثار پر مبنی ہے۔ حقیقت واقعہ یہ ہے کہ ان فرقوں کی ابتدائی تاریخ ابھی نامکمل ہے۔ کیونکہ آئے دن کی جدید تحقیقات سے ان کے اثری کارناموں پر جو روشنی پڑ رہی ہے۔ اور ان سے جو بیش قیمت معلومات اخذ ہو رہی ہیں وہ ان کے نام اور کام دونوں کی مجسم تاریخیں ہیں۔

ان قوموں کے آثار جو کئی اصناف اور مختلف ازمنہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور جن سے انکا تمدن قدیم برقرار ہے، ہندوستان کے ہر حصہ میں کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ زمانہ نے ان کو جس بیدردی اور اپنے تباہ کن ہاتھوں سے برباد کیا ہے۔ اور اس سے انکی عظمت پر جو گمنامی کا پردہ پڑ گیا ہے حقیقت میں وہ تمدن موجودہ کے لئے ناقابل تلافی ہے۔ ان کے تمدن قدیم سے تعلق رکھنے والی جس قدر چیزیں باقی ہیں وہ سب ان کے اساس مذہبی، مراسم معاشرتی اور اصول زندگی کی یادگار ہیں۔

ہندوستان کے عہد قدیم کی ہندو عمارت کا سلسلہ جناب مسیحؑ سے تقریباً دو سو پچاس سال پہلے سے شروع ہوتا ہے، اس کی ابتدا غاروں مناروں سے ہوتی ہے کیونکہ تمدن قدیم نے ہندوستان میں اسی زمانہ سے نشو و نما حاصل کی تھی، اور اسی زمانہ سے ان کے کارنامے عالم وجود میں آنے لگے تھے، اصل میں انکے زرین کارناموں سے یہی چیزیں مراد ہیں ان سے انکی تہذیب کا تعلق جسقدر ہے، انہوں نے اسکے فروغ دینے میں جسقدر کوششیں کی ہیں، وہ انکے نام کے ساتھ ہمیشہ یادگار رہے گی۔

اس فن کی نشو و نما اور ابتدا کا زمانہ ۲۵۰ سنہ قبل عیسیٰؑ تھا۔ اس زمانہ کو فن تعمیر کا پہلا دور قرار دینا چاہئے۔ کیونکہ ۱۵۰ سنہ قبل مسیحؑ کے بعد سے اس فن میں بہت سی تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں۔ چنانچہ دور اول کے طرز تعمیر کا یہ حال تھا کہ انکی عمارات بھیانک اور تاریک ہوا کرتی تھیں ان میں آسائش و زیبائش کے سامان بہت کم مہیا ہوتے تھے۔ لیکن ۱۵۰ سنہ قبل مسیح سے ان میں ایک طرح کی شائستگی اور راحت و آرام کی تدبیریں عمل میں آنے لگیں اور اس زمانہ کی متعلقہ عمارات نہایت کھلی اور ہوا دار ہوتی تھیں۔ یہ زمانہ فن سنگتراشی کا دوسرا دور ہے، اس کی زندگی ساتویں صدی عیسوی تک رہتی ہے۔ اسی زمانہ کی یادگاروں میں سے اجورا اور اجنٹا کے مشہور غار ہیں۔

اس کے بعد اس میں تدریجی ترقی ہونی شروع ہوئی۔ اور اس میں نئے نئے انداز تعمیر استعمال کئے جانے لگے۔ اور اس فن نے تھوڑے ہی عرصہ میں اس قدر ہر دلعزیزی حاصل کر لی کہ آٹھویں اور بارھویں صدی عیسوی کا وسطی زمانہ اس کے عروج کا انتہائی زمانہ تھا کیونکہ اس زمانہ میں یہ قدیم طرز تعمیر کو چھوڑ کر کشادہ اور ہوادار تعمیرات کی طرف زیادہ مایل ہونے لگے تھے۔ انکا یہ طریقہ تعمیر مسلمانوں کے دکن پہونچنے تک برابر ایک حالت میں جاری رہا۔ لیکن مسلمانوں کے قبضہ کے بعد اس کا خاتمہ نظر آتا ہے۔

—— فرانس کے مشہور مورخ ڈاکٹر گستاولی بان کا خیال ہے کہ، دکن کے طرز تعمیر کی ابتدا بھی اوسی طرح نامعلوم اور غیر محقق ہے جس طرح شمالی ہند کی، انکے اس قیاس سے اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ چھٹی صدی عیسوی میں غاری منادر نے اپنے طرز تعمیر میں غیر معمولی ترقی کی تھی۔ لیکن پھر اس بیان کے بعد ان کا خیال زمانے کے تعین کرنے سے قاصر رہتا ہے اور بقول انکے جنوب میں مدورا اور اس کے نواح جو دکن کے قدیم دارالحکومتوں سے ہیں۔ عجب نہیں کہ اسمیں انہوں نے یونان اور روم کے محققین کے بیان کے مطابق اپنی اثری یادگاریں تعمیر کی ہوں گی لیکن انکو زمانہ کی دست برد، آپس کی خانہ جنگیوں اور بیرونی چڑھائیوں نے باقی نہیں رہنے دیا۔ اس زمانہ کو جس سے تاریخ آشنا ہے، زمانہ ہجری سے تعبیر کرتے ہیں۔ اسمیں چھٹی صدی عیسوی تک ایک ایسا وقفہ ہوگیا ہے جس کے متعلق ہمیں کچھ معلوم نہیں۔

دراصل دکن کے آثار میں چھٹی صدی عیسوی کے زمانہ سے پہلے کی عمارات بہت کم پائی جاتی ہیں جنکا ہم کوئی حقیقی زمانہ متعین نہیں کر سکتے۔ البتہ سنگی کتبہ یا قدیم تحریریں جو ان پر ثبت ہیں۔ ان سے ایک حد تک زمانہ کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ اس کے علاوہ جن اصول کے ماتحت ان آثار کو زمانہ ہجری قرار دینا پڑتا ہے۔ وہ ان کے طرز تعمیر پر موقوف ہے کیونکہ قدیم تمدن میں جن چیزوں کا رواج تھا۔ وسطی زمانہ میں وہ زیادہ قابل قبول نہیں ہوئی۔

جنوبی ہند میں دکن کا علاقہ قدیم ہندو آثار اور مختلف ازمنہ کی غیر معمولی یادگاروں کا ایک زرخیز خطہ سمجھا جاتا ہے۔ ہمیں راجگان قدیم کی جو یادگاریں محفوظ ہیں۔ انکا جواب سارا ہندستان پیدا نہیں کر سکتا!

سمت تلنگانہ میں ہندوؤں نے بہ نسبت دکن کے اور مقامات کے اپنی اثری یادگاریں زیادہ چھوڑی ہیں، کیونکہ تلنگانہ کے ہندو راجہ مسلمانوں کی فتوحات کے ایک عرصہ بعد تک، دکن میں حکمران تھے۔ ان کی تعمیرات زیادہ تر وسطی زمانہ سے تعلق رکھتی ہیں حقیقت میں اس سرزمین کو قدیم ہندو دھرم کے اعتبار سے جو اہمیت حاصل ہے، وہ دکن کے کسی حصہ کو نصیب نہیں۔ خاص کر اس خطہ میں ہندوؤں کے جس قدر آثار ہیں وہ سب طریقۂ تعمیر کے اعتبار سے خاص اہمیت اور وقعت رکھتے ہیں۔ ان آثار کا دکن کے آثار میں وہی درجہ ہے جو شمالی دکن میں ایلورہ اور اجنٹہ کا ہے

تلنگانہ کی یادگاریں مختلف ازمنہ پر مشتمل ہیں۔ اور یہ کئی راجاؤں کی متحدہ اور اجتماعی کوششوں کا نتیجہ ہیں۔ ان عمارات کو دکن میں جو شہرت حاصل ہے، یا جس کے باعث یہ اسقدر شہرت رکھتے ہیں وہ محض انکا طرز تعمیر ہے۔ اس طرز کی خصوصیت یہ ہے کہ انکی عمارات کے ستون نہایت زبردست اور اونچے ہوتے تھے اور انکی ہر چیز میں اسقدر اعتدال برتا جاتا تھا کہ یہ سب اپنی اپنی جگہ بڑی موزونیت رکھتی تھیں۔ ان سب میں قابل لحاظ جو چیز تھی وہ ہوا، اور روشنی کا باضابطہ انتظام تھا۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان یا دکن میں جسقدر دیولیں یا خانقاہیں ہیں ان میں ہوا اور روشنی کے نفوذ کا بہت کم لحاظ رکھا گیا ہے۔ اصل میں دیول کی موزونیت اور خوبصورتی کا دارومدار صرف ہوا اور روشنی کے اعتدال پر ہے لیکن عام دیولوں میں اس التزام بالکل نہیں ہے۔ خاصکر مورتوں کے تناسب میں بھی اسی قسم کی بہت سی لغزشیں واقع ہوئی ہیں جس کے باعث دیول یا عمارت کا حقیقی حسن باقی نہیں رہتا۔ برخلاف اس کے تلنگانہ کی تمام عمارتیں ہر لحاظ سے قابل اہمیت ہیں۔ کیونکہ ان میں یہ سارے تعمیری تناسب اسقدر اہتمام اور موزونیت کے ساتھ جمع کئے گئے ہیں کہ انکی کوئی عمارت کبھی خلاف

اصول نظر نہیں آئے گی۔ اصل میں یہی ایک ایسی چیز ہے جس سے عمارت کی وقعت اور عزت بڑھ جاتی ہے۔ بقول ماہرین علم آثار کے اسی سے انکی صنعت اور غیر معمولی محنت کا اندازہ ہوتا ہے۔

ہم اس تمہید کے بعد اس سلسلہ کو ختم کر کے تلنگانہ کی ان مشہور عمارات کا حال لکھتے ہیں جو بلحاظ فن کے دکن کیا بلکہ سارے ہندوستان میں یکساں شہرت رکھتی ہیں۔

ہزار ستونی دیول

تلنگانہ کی مشہور عمارات میں تاریخی اعتبار سے اس دیول کو فوقیت حاصل ہے کیونکہ اس میں جو کتبہ کندہ ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دیول سنہ ۱۱۶۲ء و سنہ ۱۱۶۳ء کے درمیان تعمیر ہوئی ہے۔ اسکا بانی رودرا دیوا راول (سنہ ۱۱۶۳ء سنہء) تھا جو کاکیتیا خاندان کا مشہور و معروف راجہ ہے۔

اس دیول کا ذکر قدیم تاریخوں میں نہایت وضاحت کے ساتھ آیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دیول رایان تلنگانہ سے متعلق ہے۔ ان تواریخ کے علاوہ تلنگی زبان میں ایک کتاب پرتاب چرترا کے نام سے لکھی گئی ہے۔ جس میں راجگان تلنگانہ کا مفصل و مبسوط تذکرہ ہے۔

اس کتاب کے مصنف نے اس دیول کے تعمیر کئے جانے کی نسبت ایک عجیب و غریب وجہ بیان کی ہے۔ جس کو ہم ذیل میں بطور اقتباس نقل کرتے ہیں :-

> تلنگانہ کے مشہور راجہ کایت پول (پردلا) کے گھر ایک لڑکا پیدا ہوا جس کی نسبت منجموں نے راجہ سے یہ پیشین گوئی کی تھی کہ یہ لڑکا بڑا ہو کر تمہارے قتل کا باعث ہوگا۔ چنانچہ راجہ نے اس واقعہ کے بعد اس کو پارس لنگم کے مندر کے ایک پوجاری کو دیدیا اور ساتھ ہی ساتھ لڑکے کو ہمیشہ اپنے پاس رکھنے کی تاکید بھی کی۔ اس نے راجہ کے حکم کے موافق لڑکے کو لیجا کر اپنے گھر رکھ لیا۔ باضابطہ تعلیم دلوائی یہاں تک کہ ایک فاضل و کامل بنا دیا۔ جب راجہ کو اپنے لڑکے کے اس فضل و کمال کی اطلاع ملی تو بڑا خوش ہوا۔ اور اس پوجاری کو اس خدمت کے معاوضہ میں دو ہزار کی جمعیت سے سرفراز کر کے مہادیو کے مندر کی نگرانی کے لئے روانہ کیا اور حکم دیا کہ بلا میری اجازت کے اس کو باہر جانے نہ دینا۔
>
> اتفاق سے انہیں دنوں میں راجہ خود اسی مندر میں پوجا کی غرض سے چلا گیا، اس کا لڑکا دروازہ پر سو رہا تھا، جب اوسکو کسی آدمی کے گذرنے کی آہٹ محسوس ہوئی تو فوراً جاگ اٹھا، اور برچھالے کر راجہ کو اسقدر زخمی کر دیا کہ سوائے موت کے اوسکا اور کوئی علاج نہ تھا۔ مرتے وقت راجہ نے اس سے یہ وصیت کی کہ میرے اس قتل کے کفارہ میں تو کاشی اور رامنگم کے دیولوں کو جا اور ہر ایک دیول کی اپنے بساط کے موافق خدمت کر۔ اور وہاں سے آکر ایک دیول بنا جس کے ہزار کھم ہوں
>
> چنانچہ اس نے راجہ کے حسب وصیت یہ مندر تعمیر کیا۔

اس دیول کا تین تیرتھی دالان نہایت قدیم ہے۔ نندی منڈپ اور اس کے ایوان کی توسیع بعد میں کیگئی ہے۔ جس میں باہر کا

بڑا دالان بھی شامل ہے۔ دیول جس مقام پر تعمیر کیگئی ہے۔ اوس کی بلندی سطح زمین سے تقریباً ۲ فٹ ۴ انچ ہے۔ یہ دیول بہ قول ماہرین علم آثار کے سیوا، سوریا، اور وشنو کے ناموں سے منسوب ہے۔ کیونکہ اس میں تین قطعہ ہیں جو ایک دوسرے سے بالکل علحدہ ہیں اور ہر ایک قطعہ اس کا تیرتھ کھلاتا ہے اور یہ تینوں تین مختلف نام سے (سیوا، سوریا اور وشنو) مشہور ہیں اور ہر ایک تیرتھ پر ہر ایک دیوتا کی مورت نہایت صفائی کیساتھ کندہ ہے۔ جس سے ان مخصوص مقامات کے سمجھنے میں بڑی سہولت ہوتی ہے۔ اس کے بعض شواہد اس بات کے موید ہیں کہ یہ دیول جب راجگان کاکیتیا (گنپتی) کے قبضہ سے نکل گئی تو اسپر لنگائتوں کا قبضہ ہوگیا جنہوں نے اسکے سارے اوتاروں کی مورتیں اصلی جگہ سے علحدہ کردیں اور اسکی جگہ اپنے اوتار سلنکاس کو بٹھادیا۔ جو ابھی تک موجود ہے اور اس جگہ سے ان مورتوں کے علحدہ کرنے کے موہوم سے نشانات ابھی پائے جاتے ہیں۔

اس دیول کی تعمیری خصوصیات میں سب سے بڑی خصوصیت اس کی صناعی ہے۔ جو نہایت اعلی درجہ کے سنگ تراشوں کی برسوں کی محنت کا نتیجہ ہیں چنانچہ اس میں دروار پالک ایک ایسا مقام ہے۔ جہاں جملہ قسم کے نقش ونگار بیل، بوٹے، پھول، پتے ایک ہی انداز میں نظر آتے ہیں۔ اس مقام پر جو صناعی کی گئی ہے وہ اس قدر بہتر اور خوبصورت ہے کہ اس کا جواب ساری دیول پیدا نہیں کرسکتی۔

اس حصہ سے ملا ہوا ایک دالان ہے۔ جو بالکل سادہ ہے۔ اس کے بیچ کا کمرہ دیوی کی نشست گاہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے دو حصے ہیں۔ اسس میں بھی کسی قسم کی کوئی مورت نہیں ہے البتہ اندرونی حصہ کی چوکھٹ میں گلکاری کا بہت کام ہے۔ اور اس کے ہر دو جانب بہت سی مورتیں کندہ ہیں جو حالت رقص میں دکھائی دیتی ہیں۔

اس دیول میں متعدد کتبے ہیں جو نہایت قدیم اور مختلف زبانوں میں کندہ ہیں۔ اور یہ اکثر جگہ سے ٹوٹ گئے ہیں جس کی وجہ سے ان کے پڑھنے اور سمجھنے میں دقت ہوتی ہے۔ اس میں کے اکثر کتبے ایسے بھی ہیں جو تاریخ سے تعلق رکھتے ہیں، ان سے اس کے بانیوں کے سلسلہ پر جو روشنی پڑتی ہے وہ تاریخ کے لئے بالکل نئی چیز ہے۔

اس دیول میں سب سے قدیم کتبہ وہی ہے جو اس کے تعمیر کے زمانہ میں نصب کیا گیا تھا۔ یہ کتبہ نہایت طویل اور عریض پتھر پر قدیم سنسکرت زبان میں کندہ ہے۔ یوروپ کے اکثر محققین نے اسپر بہترین مقالے لکھے ہیں، اور یہ متعدد بار مختلف رسایل میں چھپ چکا ہے اور محققین نے اس کی تحقیق پر اپنی اپنی بساط کے موافق روشنی ڈالی ہے۔

سب سے پہلے اس کتبہ کی قدامت پر بنگال رایل ایشاٹک سوسائٹی کے رسالے نے ایک مضمون شایع کیا تھا جس میں اسکے فاضل نامہ نگار نے اس کی صحیح تاریخ تحریر ۱۰۵۴ سنہ ساکا (شک) قرار دی تھی۔ اس کے بعد اسی عنوان پر بمبئی رایل ایشیاٹک کے جرنل میں بھی مسٹر باڈرجی کا ایک مضمون چھپا تھا۔ جو نہایت طویل ہے۔ اس میں انہوں نے اسکی تاریخ کندگی ۱۰۶۴ سنہ ساکا (شک) بیان کی ہے۔ اس کے علاوہ موصوف نے کتبہ کے تحت اس کے بانی کے حالات بھی لکھے ہیں۔

لیکن ان مضامین کے تھوڑے ہی دنوں بعد مسٹر رائس نے اس کتبہ پر تحقیقی نظر ڈالی ہے۔ اور اس پر اپنے جدید معلومات مہیا کرکے اسکی صحت تاریخ پر ایک خاص مضمون لکھا ہے۔ جس میں انہوں نے اسکی ابتدائی تحقیقات سے گریز کرتے ہوئے اس کی صحیح تاریخ تحریر نویں صدی عیسوی کی قرار دی ہے۔ اور ان کے خیال میں اس میں تیلاے اول اور بھیماے دوم جو مغربی چلوکیا خاندان کے مشہور

جہ ہیں، ان کے قسمت کے نوشتوں کا حال ہے۔

ان تحقیقی مضامین کے شایع ہونے کے بعد مسٹر فلٹ نے بھی اس کی تحقیق بقول اپنے شروع کی اور ایک مضمون قدیم سنسکرت کتبوں پر ...اجو انڈین انٹی کویری کی گیارھویں جلد میں شایع ہوا ہے، اسمیں موصوف نے ان سارے محققین کی تحقیق سے بالکل علیحدگی اختیار کی ہے ...نہایت ہی زبردست وجوہ کے ساتھ ان سب سے اختلاف کیا ہے۔ اور اس کی صحیح تاریخ تحریر سنہ ۱۱۶۲ء و سنہ ۱۱۶۳ء کے وسطی زمانہ ...قرار دی ہے۔

یہ آخری نظریہ ہمیں بھی نہایت صحیح معلوم ہوتا ہے کیونکہ ان کے بعد کے مورخین نے بھی اسی کا اتباع کیا ہے۔ اسی مضمون پر میجر ہیگ ...ر مسٹر یزدانی کے مقالوں کی بنیاد ہے

یہ کتبہ بڑی اہمیت رکھنے والی چیز ہے کیونکہ اس میں ورنگل کے متعلق اس قدر صحیح معلومات ہیں۔ کہ اس سے بہتر معلومات سرزمین ...ن کی کسی تاریخ میں یکجا جمع نہیں دکھائی دیتیں

اس کتبہ کے ایک بیان کے متعلق میجر ہیگ نے اپنے مقالہ ورنگل میں ایک نظریہ قایم کیا ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ:۔

> ورنگل کے کاکیتیا خاندان نے کبھی خود مختاری کا اعلان نہیں کیا تھا۔ کیونکہ رودرا دیوا اوّل نے اپنے آپ کو مہامنڈلیس ور
> کے لقب سے ہمیشہ یاد کیا ہے۔ جس کے معنے ایک بہت بڑے امیر کے ہیں۔ اس سے خود ظاہر ہے کہ رودرا دیوا اوّل ایک
> باجگذار راجہ تھا۔ کیونکہ یہ لقب صرف باجگذار راجہ ہی اپنے نام کے ساتھ استعمال کرتے تھے۔

مولوی غلام یزدانی صاحب ناظم آثار قدیمہ سرکار عالی نے اس بیان کی تردید کی ہے اور لکھا ہے کہ:۔

> اس کتبہ سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ رودرا دیوا اوّل کس راجہ کا باجگذار تھا کولھاپور کے راجہ نے بھی اپنے آپ کو سیلاہا
> مہامنڈلیس ور اکے لقب سے ہمیشہ منسوب کیا ہے، حالانکہ وہ ایک خود مختار اور ذی اقتدار راجہ تھا۔

اس سے خود ظاہر ہے کہ یہ القاب صرف رواجی ہیں، ان کو اصلیت سے کوئی تعلق نہیں ہے، اور اس رودرا دیوا اول نے بھی بطور ...واج عام کے اختیار کیا تھا۔

میجر ہیگ نے اس کتبہ کے علاوہ ایک اور تلنگی زبان کے کتبہ کا ذکر کیا ہے۔ جس کی تر شوائی کتبۂ اول الذکر کے بہت بعد کی ہے۔ یہ کتبہ ...تاب خاں کی تعریف میں ہے جو پندرھویں صدی عیسوی کے اخیر زمانہ میں ورنگل کا صوبہ دار تھا۔ اس نے اپنے زمانہ صوبہ داری میں ہندوؤں ...ے خوب راہ و رسم پیدا کی تھی جس کی وجہ سے کچھ دنوں کے لئے یہ تلنگانہ اور کھم میٹ کا خود مختار بادشاہ بھی بن گیا تھا۔ اس کو بقول میجر ہیگ کے ...سٹر برگس نے ہند دستجا اور سیتاپتی کے نام سے یاد کیا ہے۔

قلعۂ ورنگل اس کے بعد تاریخی حیثیت سے ورنگل کا مشہور قلعہ ہے۔ جس کی بنیاد گنپتی دیوا (سنہ ۱۲۳۱ء سنہ ۵۷ یا ۱۲۶۱ء) نے رکھی تھی اس کا زمانہ تعمیر سنہ ۱۲۳۱ء سنہ ۱۲۹۴ء کا درمیانی زمانہ ہے۔ کیونکہ اسکی تکمیل رودرما دیوی (سنہ ۵۷ یا ۱۲۶۱ء سنہ ۱۲۹۲ء) کے زمانہ حکومت ...ں ہوئی تھی۔

یہ قلعہ مضبوطی و استحکام کے اعتبار سے خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اور یہ دکن کے قلعوں میں ایسا ہی ممتاز ہے۔ جیسے گولکنڈہ اور بیجاپور کے قلعے مشہور ہیں، جس پہاڑ پر یہ تعمیر کیا گیا ہے، اس کی شکل کسی قدر بیضوی ہے۔ جس مقام پر اسکا انتہائی ارتفاع ہے اس کی بلندی سطح زمین سے تقریباً ۴۰۰ فٹ ہے۔

اس قلعہ میں دو فصیلیں ہیں پہلی مٹی کی ہے، دوسری پتھر سے باندھی گئی ہے، اس کے اطراف میں ایک نہایت عمیق خندق ہے۔ جس کا عرض تقریباً ۲۰۰ فٹ اور عمق ۵-۶ فٹ کے قریب ہے۔ یوں تو قلعہ کے تین حصار ہیں، لیکن پہلا حصار زمانہ کی دست درازیوں کے باعث باقی نہیں رہا۔ اس کے موہوم سے نقوش اگلی یادگار کے شاہد ہیں، اس کے متعلق مسٹر کاؤزنس کا خیال ہے کہ یہ حصار تقریباً ۳۰ میل کے احاطہ پر مشتمل تھا۔ کیونکہ بقول ان کے ہنمکنڈے کے جانب جنوب ایک سنگین دہلیز ملی ہے جس کا طول ۲۰ فٹ ہے۔ اس سے اندازہ کیا جاتا ہے کہ یہ دہلیز اسی فصیل سے تعلق رکھتی ہے۔

ہمارے خیال میں یہ فصیل قلعہ کی فصیل میں شمار نہیں کی جاسکتی بلکہ اسکو شہر پناہ کی فصیل کہنا چاہئے اس لئے کہ سارے ہندوستان میں اتنا بڑا حصار کسی قلعہ میں نہیں پایا گیا ہے۔

قلعہ کی اندرونی فصیل جو پتھر کی ہے، اس میں چار دروازہ ہیں، شمال اور جنوب کے دروازے ہمیشہ بند رہتے ہیں، ان دروازوں کا طرز تعمیر بالکل عجیب واقع ہوا ہے۔ اس کے ہر دروازے کے اوپر شیر ببر کی مورت کندہ ہے۔ یہ ببر بھی بالکل نئی طرح کے ہیں۔ انکی نسبت ڈاکٹر ہینٹ ماہر آثار قدیمہ کا خیال ہے کہ یہ ببر اشوریا اور بابل کے ببروں سے قریب قریب بہت مشابہت رکھتے ہیں۔

ان دروازوں کی دہلیز کے اندرونی سنگی ستونوں پر نہایت قدیم کتبہ کندہ ہیں جو امتداد زمانہ کے باعث محو ہونے کے قریب ہو گئے ہیں۔

قلعہ کے حصار مختلف ناموں سے مشہور ہیں۔ بیرونی حصار بھومی کوٹ کہلاتا ہے۔ اندرونی پیداکوٹ کے نام سے منسوب ہے، ان دونوں حصاروں کا درمیانی رقبہ تقریباً ۴ میل کے مساوی ہے۔ گمان غالب ہے کہ اس حصہ میں پہلے زراعت ہوتی ہوگی کیونکہ اب بھی اس کے اکثر زرخیز مقامات اس امر کے شاہد ہیں۔

قلعہ کے بیرونی فصیل کے اطراف میں خندق حایل ہے اس لئے یہ غیر معمولی بلند دکھائی دیتی ہے۔ دراصل اسکی حقیقی بلندی سطح زمین سے تقریباً ۳۰ یا ۴۰ فٹ ہے۔ اس میں تھوڑے تھوڑے فاصلہ سے نہایت نفیس برج ہیں انکا اندرونی اور بالائی حصہ زیادہ کشادہ ہے۔

یہ قلعہ جب مسلمان فاتحین کے ہاتھ آیا تو انہوں نے اس میں غیر معمولی توسیع کی۔ اسکے علاوہ اس میں کئی ایک نئی چیزوں کا اضافہ کیا۔ بقول مولانا یزدانی کے اسمیں کی قدیم عمارتیں جو زمانہ ہنود میں تعمیر ہوئی تھیں۔ وہ مسلمانوں کی معرکہ آرائیوں سے تباہ ہوگئیں۔ انکے منہدمہ پتھر نہایت نفیس اور نقشی تھے، مسلمانوں کی جدید عمارات میں استعمال کئے گئے ہیں۔ جس کی وجہ سے اس کی قدیم فن تعمیر کے آثار مفقود ہو چلے ہیں۔

اس قلعہ کی قابل ذکر خصوصیات میں ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس کے اوپر جانے والی ساری سیڑھیاں بالکل مستطیل واقع

ہوئی ہیں جو طول میں تقریباً ۲۰۰ فٹ کے قریب ہیں۔ شاید اس کے تعمیر کرنے سے انکا یہ منشا تھا کہ بیرونی حملوں سے ان کے ملکی اثرات پر جو اثر پڑتا تھا اور جس کے باعث ان کو جانی اور مالی نقصانات برداشت کرنے پڑتے تھے اس کا اندیشہ جاتا رہے مگر اس پر اس قدر صدیاں گذرنے کے بعد بھی اس کی اصلی صورت میں کسی قسم کا فرق نہیں آیا۔ اب بھی نہایت اچھی حالت ہے۔

ابتدا میں یہ قلعہ راجگان کاکتیا کے زیر اثر تھا ان سے محمد تغلق (سنہ سنہ) نے سنہ ۱۳۲۱ء میں فتح کیا۔ مگر ان سے صلح ہو جانے پر پھر اس کو بطور خراج مسترد کر دیا۔ سنہ ۱۴۲۲ء میں یہ قلعہ بیدر کے شاہان بہمنیہ کے قبضہ میں تھا۔ ان سے سلاطین قطب شاہیہ کی عملداری میں آیا۔ ان کے بعد اسپر اورنگ زیب عالمگیر کا قبضہ ہوا۔ اب یہ حیدرآباد کے آصفیہ خاندان کی عملداری میں ہے۔

قلعہ کی دیول

قلعہ کی اندرونی یادگاروں سے ایک قدیم دیول ہے۔ جس کو ہم سلسلہ کے لحاظ سے تیسرے دور میں شامل کرتے ہیں۔ یہ دیول گنپتی دیو (سنہ ۱۱۳۳ء ۵ یا سنہ ۱۲۶۱ء) نے تعمیر کی تھی۔ لیکن یہ ایسی عظیم الشان عمارت ہے کہ اوسکا ایک راجہ کے عہد حکومت میں تعمیر ہو جانا بالکل ناممکن تھا۔ اس لئے یہ نامکمل حالت میں رہ گئی۔ اسکی خراب و خستہ حالت تباہ و بوسیدہ چھت منہدم ستون جواب یادگار زمانہ ہیں اون کے دیکھنے سے اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ یہ مندر طرز تعمیر کے اعتبار سے فن سنگ تراشی کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ اگر یہ اپنی پہلی حالت میں موجود رہتا تو اسکا شمار تعمیری نقطۂ نظر سے تلنگانہ کا کیا بلکہ سارے دکن کی ہندو عمارات سے غیر معمولی درجہ رکھتا۔

اس دیول کے منہدم دروازوں کی نسبت مسٹر فرگوسن لکھتے ہیں کہ یہ دروازے سانچی کے دروازوں سے بالکل مشابہت رکھتے ہیں جن کو جین کے ساتواہانا خاندان نے پہلی صدی عیسوی میں تعمیر کیا تھا۔ ان دروازوں کا طرز تعمیر بالکل بدھی پایا جاتا ہے، لیکن اس طرز کا استعمال دکن ہی سے شروع ہوا۔ اس نے یہیں نشو و نما پائی اور بدھ مت کے ختم ہو جانے کے بعد بھی ایک زمانہ تک اس کا دکن میں عام رواج تھا۔ اس قسم کے درواز کلپاک کے نواح میں اکثر پائے جاتے ہیں۔

ورنگل کے دروازے حالانکہ سانچی کے دروازوں سے زیادہ مختلف الوضع نہیں ہیں۔ تاہم مشابہت ضرور رکھتے ہیں ہرچند قلعۂ ورنگل کے دروازے سانچی کے دروازوں سے ایک ہزار سال بعد بنائے گئے ہیں۔ لیکن ان کو غور سے دیکھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ یہ دروازے لکڑی کے سانچے کا نمونہ ہیں۔ اس قسم کے ستونوں کا رواج دکن میں آجتک موجود ہے۔ چنانچہ اس نوعیت کی ایک حاضر مثال راجہ صاحب اناگوندی کا مکان ہے۔

ان دروازوں کے شمالی اور جنوبی حصہ کا درمیانی فصل ۴۸۰ فٹ ہے۔ اس کے مغربی اور مشرقی حصہ کو ۴۳۰ فٹ کی مسافت جدا کرتی ہے۔ اس طویل اور عریض مربع سے اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ یہ دیول کس قدر وسیع ہوگی!

جس حصہ میں اسکا سنگ بنیاد رکھا گیا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ مندر جب تباہ ہو گیا تو اس وقت اس کے بہت سے اساس مذہبی تہ خاک پیوند ہو گئے۔ اور بہت سارے کتبے جنسے ان کی گذشتہ تاریخ کی ترتیب میں مدد ملتی تھی وہ سب اس حصہ میں محفوظ ہیں اگر

اس حصہ کو کھدوایا جائے تو عجب نہیں کہ اسمیں سے نہایت قدیم قدیم کتبے نکلیں گے۔ جس سے ان کے خاندان کی عظمت و امتیاز پر غیر معمولی روشنی پڑے گی۔ اور ان کے سلسلۂ نسب کا بھی حقیقی پتہ لگ جائے گا۔ اس کے علاوہ اور بہت سی ایسی چیزیں عالم وجود میں آئیں گی جس سے دنیا ابھی تک ناواقف ہے۔

قلعے کے بعض قدیم منادر اس مندر کے سوا قلعہ میں اور بہت سی قدیم اور جدید دیولیں ہیں۔ ان میں کی بعض دیولیں تو نہایت قدیم ہیں۔ ان کا سنہ تعمیر یقیناً بڑی دیول سے بہت پہلے کا ہے۔ لیکن یہ فن تعمیر کی ابتدائی کڑی ہونے کے لحاظ سے نہایت مبتذل واقع ہوئی ہیں۔ اور فنی اعتبار سے ان کا کوئی خاص درجہ نہیں ہے۔ البتہ قدیم کتبات جو ان پر کندہ ہیں۔ ان سے انکی شان ایک حد تک ارفع و بلند ہوجاتی ہے۔

سمبھوگدی "مندر" ان مندروں کے سامنے ایک مندر واقع ہے، جس کو سمبھوگدی کا مندر کہتے ہیں۔ اس کے صحن میں پتھر کے تین ہاتھی ہیں ان میں کا ایک ہاتھی کسی قدر مجروح ہوگیا ہے۔ ان کی نسبت ہمارا خیال ہے کہ یہ ہاتھی عجب نہیں کہ بڑے مندر کے لئے بنائے گئے، لیکن جب یہ مندر تباہ ہونے کے قریب ہوگیا تو ان کو اس کی اصلی جگہ سے علحدہ کر کے یہاں رکھدیا گیا ہے۔

ونکاٹیساگدی "مندر" اسی قبیل سے ایک اور مندر ہے جس کو ونکاٹیساگدی کہتے ہیں۔ اس میں نہایت نفیس صناعی کی گئی ہے۔ اور یہ طریقۂ کندیدگی کے اعتبار سے بڑا درجہ رکھتا ہے۔ کیونکہ اس کے اندرونی استادہ ستون اس نزاکت سے تراش کر نصب کئے گئے ہیں کہ انہیں جس پہلو سے دیکھا جائے، ایک ہی سیدھ میں دکھائی دیتے ہیں۔

شتاب خاں کا دربار ہال اس مندر کے دروازے سے بالکل قریب میں ایک پٹھان طرز کی عمارت ہے۔ جو شتاب خاں کے دربار ہال کے نام سے مشہور ہے۔ یہ عمارت بھی نامکمل حالت میں ہے۔

چمپیتی مندر اس کے بالکل سامنے ایک دیول ہے جو کئی ستونوں پر قائم ہے۔ اس دیول کی ایک خاص خصوصیت یہ ہے کہ اسکے سارے ستون خطوط وحدانی کی شکل میں ہیں۔ یہ ستون اس دیدہ ریزی اور کارگیری سے اپنی اپنی جگہ نصب کئے گئے ہیں کہ باوجود اس پر سات سو سال کے طویل عرصہ کے گذرنے کے بعد بھی انکی استقامت میں کسی قسم کا کوئی فرق نہیں آیا۔ اس کے ایک ستون پر ایک کتبہ کندہ ہے۔ جس سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ یہ دیول ۱۱۳۵ء میں رودرا چوپتی نے اس یادگار میں تعمیر کی تھی جو اسکو راجہ تلنگانی کے مقابلہ میں فتح حاصل ہوئی تھی۔

ان آثار قدیمہ کے علاوہ اس میں اور بہت سی یادگاریں محفوظ ہیں جو جدید ہونے کی وجہ سے نظر انداز کی گئی ہیں۔ ان میں سے بعض ایسی بھی ہیں جو قدیم ہیں مگر انکی کوئی تحقیق نہ ہوسکی۔

مسجد ان منادر کے جنوب میں ایک مسجد بھی واقع ہے۔ جس کو مسلمانوں نے قلعہ فتح کرنے کے بعد تعمیر کیا تھا۔

انبار خانہ اور رسد خانہ قلعہ کے شمال میں بہت سے بوسیدہ مکانات ہیں جنکی نسبت ماہرین آثار کا خیال ہے کہ یہ راجگان ورنگل کے

انبار خانے اور رسد خانے کے کمرے تھے۔

ان مختصر آثار کے علاوہ تلنگانہ کے آثار قدیمہ میں اور کوئی قابل ذکر چیز نہیں ہے۔

کتبہ

جو ہنمکنڈے کے مشہور ہزار ستونی دیول پر ۱۱۶۲ء و ۱۱۶۳ء کا سنسکرت زبان میں کندہ ہے[1]۔

خدا ہمارے ملک کو فتح و کامرانی سرسبزی و شادابی عطا کرے، رودرادیوار مہامندلیس ورا جیسے ذی اقتدار راجہ کا زمانہ حکومت شوکت و دبدبہ اور فتحمندیوں سے بھرا تھا اور وہ ہنمکنڈہ جیسے بہترین شہر پر نہایت جاہ و جلال کے ساتھ حکمران تھا جہالیس ورا کا بیٹا پرستار تھا۔ اوس کے سارے افعال مالک کی خاطر تھے اور وہ شرم و مروت کا مجسم پتلا تھا۔ طرز جہانبانی کو اسکی شیریں بیانی نے چار چاند لگا دیے تھے

دوادارہ یعنے ۱۲ ماہ سکہ سال سک میں لیسورامسری دشنودیوا اور سری دیوار کے ناموں پر اپنے نام کا سکہ بٹھایا[2]۔ میں ہری کی تعریف میں رطب اللسان ہوں جب اس نے کرہ زمین کو اوپر کی طرف اوٹھایا تو سات سمندر کی موجیں اٹھ اٹھ کر اوس پر یورش کرنے لگیں جو بہ مشکل تمام اس کے پاؤں کے انگوٹھوں کے ناخن تک پہونچ سکے۔ اور تینوں عالم پانی کے ایک قطرہ کی طرح اسکی جھونپڑی میں سماگئے۔ یہ جھونپڑی اوس کے دانت کا صرف ایک گوشہ تھی۔ اے سری ہر ہمارے حال پر لطف و کرم کی نظر کر، تو ان شہد کی مکھیوں کا نشیمن ہے۔ جو تیرے پاکیزہ کے عطر بیز غنچوں کی کشش سے کھنچی ہوئی پاس چلی آتی ہیں۔ خدا کرے سرسوتی علم کی دیوی مرے دل میں آبسے، جس کو میں اپنی ماں کے برابر سمجھتا ہوں۔ وہ دودھ کی دھار دریمیں بلند مدارج پر پہونچاتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ سرچشمہ علم سرسوتی چاند کے نور سے گوندھی ہوئی ہے یا ہلکے ہلکے صندلی رنگ کا ایک مجسمہ ہے۔ میں یعنے اچتندورا سری رامیس ورداکشتیا کا بیٹا ہوں جو بھرت راجہ کے خاندان کی عزت کا بڑھانے والا تھا۔ اور سرتا کے رسوم کو نہایت توقیر کے ساتھ ادا کیا کرتا تھا۔ وہ دنیا کا بہترین آدمی تھا۔

تھری بھوانا ملا کاکیٹیا نسل کا ایک فتحمند راجہ تھا۔ جس سے ذی جبروت دشمنوں کی بیویوں کا سہاگ جاتا رہتا تھا۔ اسکے نام سے بڑے بڑے سرکشوں کے دل ہل جایا کرتے تھے۔ مستحق لوگ اس کے فیض و کرم سے مستفید ہوتے تھے۔ خوش گلو اور

---

[1] اس کتبہ کا ہم نے انڈین انٹی کویری جلد ۱۱ صفحہ ۹ سے خلاصہ کیا ہے۔

[2] یہ عبارت بطور جملہ معترضہ کے آئی ہے۔

حسین نازک اندام نازنین اسکی دل وجان سے گرویدہ ہوتی تھیں۔

اس کے بیٹے پروٹے نے بڑی ناموری حاصل کی تھی اور ایک لمحہ میں اس نے تیلاپادوا جیسے سپاہی منش راجہ کو جو چلوکیا خاندان کی ناک تھا ایک معرکہ میں قید کرلیا، اس نے گووندراجہ پر بھی چڑھائی کی اور اسے دم بھر میں اسیر کرلیا۔ اور پھر اوس کو اپنی شاہانہ فیاضی سے رہا کردیا۔ اسکی سلطنت اُدیوار راجہ کو دے دی۔ میشرم (یا جگدار) گووند اسکے ہاتھوں شکست کھاکر اپنے شہر کی طرف فرار ہوگیا۔ جس کے بعد پروٹے نے پھر اس جنگ کے لئے مقابلہ کو طلب کیا۔ جگدیوار جیسے ذی اقتدار راجہ کی شخصیت کو اس نے معرض زوال میں ڈال دیا۔ اور اسکی ساری قوتیں سلب کرلیں۔ اس کے بعد پماراتی اس کی بیوی بنی۔ جس کے دلفریب حسن کی تعریف نہیں ہوسکتی۔ اس کے بطن سے دنیا کا مکھ یعنے سری رودرادیوار پیدا ہوا جس کا تعلق سری کرشنا سے وابستہ ہے۔

اس نے آن کی آن میں دوٹا کا سارا زور توڑ ڈالا، جو بڑا قد آور صاحب قوت اور شہسوار تھا۔ اس کے بعد راجہ رودرا نے کئی بہتر سے بہتر شہر اپنی راجدھانی میں شامل کئے۔

عمر بھر میں سری رودرا کی تعریف کرتا ہونگا جو میدان کی شرارتوں کو کچل سکتا ہے۔ اور جو بلند اور اولوالعزم ارادوں کا اور مشوروں کا علمبردار ہے۔ جس کی تاب اوس کے دشمن نہیں لاسکتے۔ اس نے ظفر مند میلی گیدوا جیسے نامور شخص کی شان وآبرو کو خاک میں ملایا۔ سری پلواسا جیسے زبردست راجہ کی ساری دولت سمیٹ لی۔ کوکرانا اگرچہ ایک کم اصل انسان تھا۔ لیکن وہ تمام دنیا کا ہیرو بن بیٹھا تھا۔ اس کو بھیما جیسی خوفناک ہستی نے موت کے گھاٹ اتارا۔ اور پھر وہ چہکتے ہوئے بلبل کی طرح دنیا سے سدھارا۔ اونہی دنوں میں راجہ چیدودیا نے بھی عالم دیوانگی میں راہ لی۔ اور تیلپا بھی سری رودرادیوار کے رعب ودہشت سے چل بسا۔ بھیما جیسے بدبخت نے اس کی جگہ سنبھالی۔ یہ اپنی حکومت کے نشہ میں چور تھا، اور سری رودرا جیسے بہادر کے مقابلہ میں خم ٹھوکنے کی جرأت کر بیٹھا۔ رودرا نے بھیما کی شیخیاں سنیں تو اس کا خون معرکہ آرائی اور فتحمندی کے جوش میں ابلنے لگا۔ چنانچہ ایک لشکر جرار کیساتھ روانہ ہوا۔

اس کی ان شاندار تیاریوں کو دیکھ کر بڑے بڑے مخالف راجہ کانپنے لگے۔ سب سے پہلے راجہ نے شہر وہمن نگری کو اپنے قہر وغضب کا نشانہ بنایا۔ بھیما نے راجہ کی اس شان جلالی کو دیکھا، تو ہوش جاتے رہے اور سب چھوڑ چھاڑ کر بڑی بے حیائی کے ساتھ اپنے بھائی، ماں، بہن، بیوی، کو لیکر جنگل کی راہ لی، راجہ نے بھی اس کا تعاقب کیا اور چیدودیا کے شہر کو آگ لگادی، اور پیچ در پیچ جنگلوں کا صفایا کرڈالا، جو اس کی راہ میں حایل ہوئے پھر اس نے ایک عظیم الشان اور عجیب وغریب تالاب شہر کے بیچوں بیچ بنایا۔

بھیما اور دوسرے راجہ جو کانچی اور وندھیا کے درمیان رہتے تھے۔ جو سلطنت کے غرور میں اپنی اپنی جگہ خدا

بنے بیٹھے تھے۔ لیکن جب ان کے مزاج درست ہوگئے اور ہوش ٹھکانے لگے تو ردرا کے دامن میں پناہ گزیں ہوئے۔

اس کا دار الحکومت اماکنڈہ شہر گندریا کی طرح راحت و آرام معمور تھا۔ اور اس کا ہر گوشہ گندری کی طرح جشنو اور وشنو کی دیولوں سے آراستہ و پیراستہ ہے۔

یہاں پر نازک اندام اور پری پیکر جادو بھری نینوں والی عورتوں کا ایک میلا لگا رہتا ہے۔ جو نہایت انداز کیساتھ مسکراتی ہوئی اپنی ابھری ابھری چھاتیوں کو سنبھال سنبھال کر چلتی ہیں، برہمنوں کے مکانوں میں نوجوان طالبعلموں کے ساتھ سیانے طوطے بھی ہیں۔ جو اُن کے ہم آہنگ ہوکر دیدن کی رٹ لگاتے ہیں۔

سری رودرا کے گھوڑے آسمان پر دھاوے نہیں کرتے۔ کیونکہ یہ وہ مقام ہے جہاں وشنو کے قدم پڑے تھے۔ نہ وہ اپنی ٹاپوں سے زمین کو پامال کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ ان کے نزدیک ایک مقدس گائے کا رتبہ رکھتے ہیں۔ لیکن گھوڑوں کی یہ فوج غنیم کے حق میں ایک بلائے ناگہانی ہے۔ اس کے گھوڑے مشہور و معروف خصائل سے متصف ہیں۔ بڑے بجیلے برق رفتار اور انتہا کے باربردار ہیں انکی عمر بھی خاصی بڑی ہوتی ہے۔ رفتار کی پانچوں قسموں میں خوب طاق ہیں۔

اس کی قلمرو مشرق میں دریائے شور تک پھیلی ہوئی ہے۔ اس کی قوت اقتدار کا سکہ تمام جنوبی حصہ میں یعنے سری سیلا تک رواں ہے۔ اس کے حدود کے ایک جانب کٹک ہے۔ دوسری جانب تمام مغربی ممالک۔ جانب شمال ملیادنتا کے پہاڑ جو اپنی ناہموار بلندیوں کی دلفریبی میں مشہور ہیں۔

راجہ رودرا دوتے "جس کی سب عزت و تکریم کرتے ہیں۔ سری مہیسارادی اور سوری جیسے دیوتاؤں کی پرستش کیلئے ایک عظیم الشان قبضہ متی جورودلہ مستقل طور پر وقف کر دیا۔

ماخذ

(۱) انڈین انٹی کویری (جرنل) . . . . جلد (۱۰) و (۱۱)

(۲) جرنل دکن ارکیولوجیکل سوسائٹی آف حیدرآباد۔ بابتہ سنہ ۱۹۱۶ء

(۳) لینڈمارک آف دکن . . . . مصنفہ لفٹنٹ میجر ہیگ مطبوعہ سنہ ۱۹۱۷ء

(۴) ہسٹاریکل ڈسکرپٹیو اسکیچ آف دی نظام ڈومینس . . . . مولفہ عماد الملک بہادر طبع قدیم۔

(۵) تاریخ قادری . . . . مصنفہ منشی قادر خاں بیدری سنہ تصنیف سنہ ۱۲۴۹ء قلمی

(۶) تاریخ قلمروئے نظام . . . . مترجمہ مولوی شمس الدین صاحب نجم

(۷) گزیٹر ممالک محروسہ سرکار عالی مرتبہ مہدی خاں صاحب مطبوعہ سنہ ۱۹۰۸ء

(۸) امپیریل گزیٹیر آف انڈیا .... جلد ۴

(۹) واقعات بیجاپور حصہ سوم .... مصنفہ مولوی بشیر احمد صاحب مطبوعہ سنہ ۱۹۱۵ء

(۱۰) ہندوستان کا فن تعمیر .... از فرگوسن جلد (۱)

(۱۱) جنرل بنگال رائل ایشیاٹک سوسائٹی .... جلد (۷) صفحہ (۹۰۱)

(۱۲) جنرل بمبئی رائل ایشیاٹک سوسائٹی .... جلد (۱۰) صفحہ (۴۶)

(۱۳) رپورٹ مغربی تعمیرات ہندوستان .... از مسٹر کاذنس بابتہ سنہ ۹۵-۱۸۹۴ء

(۱۴) تمدن ہند .... مترجمہ ڈاکٹر سید علی بلگرامی مطبوعہ سنہ ۱۹۱۳ء

(۱۵) پرتاب چرترا (تلنگی) .... قلمی

(۱۶) رپورٹ آثار قدیمہ سرکار عالی .... مرتبہ مولوی غلام یزدانی صاحب

ان کتابوں کے سوا ذیل کے رسایل اور کتابوں سے بھی ہمنے استفادہ کیا ہے۔

"رسالہ نمائش حیدرآباد بابتہ اگست سنہ ۱۹۲۶ء و اخبار ریاست دہلی جلد ۵ نمبر ۶ بابتہ ستمبر و ہسٹری آف میڈیول دکن ۵ صفحہ ۴۵ تاریخ بیجانگر مولفہ سورج نرائن صاحب صفحہ ۵۶"

سید احمد اللہ قادری۔ ایم آر اے ایس (لندن)

علم فراست الید

یعنی ہات کی لکیروں، ہات کی ساخت، اونگلیاں اور ناخن دیکھکر ایک شخص کی سیرت و اخلاق پر حکم لگانے اور اسکے ماضی و مستقبل کے حالات معلوم کرنیکا علم اگر آپ ایک ہفتہ کے اندر سیکھنا چاہتے ہیں تو یہ کتاب ہمسے طلب کیجئے جو نہایت سہل زبان میں، نقشوں وغیرہ کی مدد سے آپکو بہت جلد اس فن کا ماہر بنادیگی۔

قیمت ایک روپیہ عہ علاوہ محصول

منیجر "نگار" لکھنؤ

شکستِ عہد

پرناچندر پڑھنے کو یوں تو بی۔اے میں پڑھتے تھے لیکن انگریزی تعلیم اور ایک انگریزی تعلیم پر کیا منحصر تھا نئی روشنی اور مغربی تمدن کی کل چیزوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ یہ صرف خاندان اور سب سے بڑھکر انکی ماں کا شدید اصرار تھا کہ وہ اپنے مزاج اور طبیعت کے خلاف کالج میں پڑھ رہے تھے۔ ورنہ واقعات تو یہی بتاتے ہیں کہ وہ سینٹ زیویر کالج کلکتہ کی شاندار عمارت میں پڑھنے کے بجائے کسی پنڈت کے ٹوٹے ہوئے جھونپڑے میں، زمین پر بیٹھکر مذہبی کتب کا درس لیتے رہتے۔ وہ سنسکرت زبان کے عاشق تھے۔ اور ہرچند کالج کے مشاغل سے بہت ہی کم فرصت ملتی تاہم کوئی نہ کوئی سنسکرت کی کتاب برابر ان کے زیر مطالعہ رہا کرتی۔ پوجا پاٹ اور اپنے مذہب کے احکام کی تعمیل وہ بہت ہی خلوص اور انہماک سے انجام دیا کرتے۔ ان کے دوستوں کا بیان ہے کہ وہ بعض وقت جاڑے کے ایام میں دو دو بجے شب کے وقت گنگاجی میں اشنان کرنے گئے ہیں۔ انکی وضع بالکل قدیمانہ تھی۔ موٹا کھاتے موٹا پہنتے اور نہایت ہی سادہ بے تکلف زندگی بسر کیا کرتے۔ وہ نئی روشنی کے دشمن تھے اور ان کے خیال میں ملک کی تباہی و بربادی کا اصل راز انگریزی تعلیم کے اندر مضمر تھا۔ وہ جس وقت راجہ رامچندر جی اور سری کرشن جی مہاراج کا زمانہ یاد کرتے تو انکی چھاتی پر ایک سانپ سا لوٹ جاتا۔ دل میں کہتے۔ وہ زمانہ تو خیر آنا مشکل ہے۔ نہ ویسے لوگ پیدا ہونگے۔ نہ انکی تعلیم پر کوئی چلنے والا ہوگا۔ آج سے سو دو سو سال قبل ہی کی حالت کا مطالعہ کریجئے اور دیکھئے کہ ہماری ذہنیت میں کتنی تبدیلی پیدا ہو چکی ہے۔ انکا خیال تھا کہ ہماری مذہبی روح اور ہماری روحانی قوت محض انگریزی تعلیم اور مغربی تمدن کی بدولت دن بدن فنا ہوتی جا رہی ہے۔

پرناچندر اکثر کہتے کہ ہندوستان کی بھلائی نہ ترک موالات سے ہوسکتی ہے اور نہ شدھی و سنگھٹن سے۔ نہ کانگریس اور کانفرنس سے کوئی مفید نتیجہ نکالا جاسکتا ہے اور نہ ہندو سبھا کی کوشش سے تاوقتیکہ نئی روشنی اور جدید تہذیب کا قطعی طور پر قلع قمع نہ کر دیا جائے۔ جبتک ہماری ذہنیت میں تبدیلی پیدا نہ ہوگی۔ جبتک ہم انکی تعلیم پر عمل پیرا نہ ہونگے جب تک ہم میں وہی قدیمی روح پیدا نہ ہوگی، ان تحریکوں سے سوائے ذلت و پریشانی اور آپس میں نفرت و عناد کا جذبہ پیدا ہونے کے، کوئی مفید اور عملی نتیجہ ظاہر نہیں ہوسکتا

بھارت کی سادہ زندگی انہیں بہت مرغوب تھی۔ جب کبھی وہ مکان آتے اور سیدھے سادے بھولے بھالے کاشتکاروں کے جھرمٹ میں بیٹھکر ہمکلام ہوتے تو انہیں ایک روحانی مسرت حاصل ہوتی جس کا بیان مشکل ہے۔ کلکتہ کی چہل پہل اور گہما گہمی سے کون ناواقف ہے؟ ڈلہوزی اور چورنگی کے دلچسپ مناظر کس کو محو حیرت نہیں بناتے؟ لیکن پرناچندر کی آنکھوں میں ان چیزوں کی کوئی وقعت نہ تھی۔ وہ ہوسٹل کی چار دیواری سے شاذ و نادر ہی باہر آتے۔ انہیں سوائے کالج جانے، ہوسٹل میں رہنے، اور مذہبی کتب کا مطالعہ کرنے کے کوئی دوسرا مشغلہ ہی نہ تھا۔ اس لئے نہیں کہ انہیں آبادی سے نفرت تھی یا وہ اپنے ابنائے جنس سے ملنا ناپسند کرتے تھے بلکہ اس لئے کہ انہیں ان تمام باتوں میں تکلف اور تصنع کا رنگ نظر آتا تھا۔ یا دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ مذہبی تعلیم ان باتوں کے سراسر منافی تھی۔

یوں تو زمانہ کی زبان کون پکڑ سکتا ہے۔ ہر شخص اپنے اپنے حوصلہ کے بموجب پرناچندر کی نسبت جو چاہتا تھا کہتا تھا۔ لیکن اسمیں شک نہیں کہ وہ اپنے اصول کے بہت پکے، مذہب کے بہت پابند اور انسانی اوصاف کے لحاظ سے بہت ہی سچے اور راست باز انسان تھے

(۲)

درگا پوجا کی تعطیل تھی۔ کالج ایک ماہ کے لئے بند تھا کالج کے طلبہ سیر و تفریح کی غرض سے مختلف مقامات میں جانیکی تیاریاں کر رہے تھے۔ لیکن پرناچندر نے ابھی تک کہیں جانیکا ارادہ نہیں کیا تھا۔ وہ ہوسٹل ہی میں رہے اور نصف سے زیادہ تعطیل تن تنہا ہوسٹل ہی میں گذار دی۔ ان کے وقت کا زیادہ حصہ مذہبی و دینی کتب کے مطالعہ میں بسر ہوتا تھا اور وہ ہمیشہ اس سوچ میں رہتے تھے! ہم کیا تھے اور اب ہماری کیا حالت ہوگئی ہے۔ جب اختتام تعطیل کو بہت کم دن باقی رہ گئے تو انہوں نے مکان جانے کا ارادہ کیا اور شام کی اکسپرس سے سوار ہو کر دوسرے دن اپنی بستی گونڈھ میں پہونچ گئے۔

(۳)

صبح کا وقت تھا، پرناچندر پوجا پاٹ سے فارغ ہو کر کئی ہفتہ قبل کا ایک اخبار اٹھا کر دیکھ رہے تھے۔ ان کی ماں مسکراتی ہوئی کمرہ میں داخل ہوئیں۔ وہ ایک بیوہ عورت تھیں۔ پرناچندر کے پتا عرصہ ہوا مر چکے تھے۔ انہوں نے کمرہ میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ "پرنا! میں تم سے ایک بہت ضروری بات کہنے آئی ہوں۔ جہاں تک ممکن ہو جلد جواب دینا۔ تم ساری تعطیل ختم کر کے تو یہاں آئے ہو"

پرناچندر دونوں ہاتھوں کو جوڑ کر مودبانہ کھڑے ہوگئے۔ وہ اپنی ماں کی بڑی عزت کرتے تھے۔ سر جھکائے ہوئے بولے۔ "جی ہاں۔ کیا بتاؤں۔ کالج کے مشاغل سے بہت کم فرصت ملتی ہے۔ کیا کوئی بہت ضروری کام ہے"

"ہاں بہت ضروری" ماں نے چوکی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "اتنا ضروری کہ تمہیں آج ہی بلکہ اسی وقت جواب دینا ہوگا"

ماں کو ہنسی آگئی۔ پرناچندر بھی مسکراتے ہوئے کرسی پر بیٹھ گئے

تھوڑی دیر کے بعد ماں بولیں۔ "پرنا! میری خواہش ہے اور دلی خواہش ہے کہ اب میں تمہاری دلھن بیاہ کر لاؤں۔ دنیا ہنستی ہے کہ ابھی تک لڑکے کا بیاہ نہ کیا۔ میں سچ پوچھو، تو شرم سے گڑی جاتی ہوں۔ بات بھی سچ ہے۔ جوالا تم سے چھوٹا ہے۔ ڈیڑھ دو سال چھوٹا ہوگا۔ چیت میں پیدا ہوا تھا۔ ابکی اٹھوارھواں لگے گا۔ ایشور کی دیا سے اس کی شادی بھی ہو گئی۔ ایک بچہ بھی پیدا ہوا۔ اور تم ہو کہ شادی کے نام سے کوسوں بھاگتے ہو۔ آخر میں کب تک جیتی رہونگی۔ میری زندگی میں تمہارا بیاہ نہ ہوا تو آخر کب ہوگا؟ اب تو میں تمہاری ایک نہ سنوں گی۔ اسی کرسمس کی تعطیل میں میں بیاہ کا انتظام کرتی ہوں۔ جدو بابو وکیل کو تو تم جانتے ہی ہو۔ ان کی بیوی کل آئی تھیں۔ راجکماری کی بابت ذکر آیا۔ مجھے بھی بے حد پسند ہے۔ ایسی اچھی لڑکی، میرے خیال میں، ملنا بہت مشکل ہے۔ دیکھو اگر تم نے اس مرتبہ میری بات نہ مانی تو مجھے بہت صدمہ ہوگا۔

پرناچندر شادی کے مخالف تھے۔ کئی پیغام اب تک مسترد کر چکے تھے۔ انکا شادی کرنے کا ارادہ نہ تھا۔ اور وہ کچھ عجیب و غریب قسم کی دلیل اس کے متعلق رکھتے تھے۔ عموماً لوگ طالب علمی کے زمانہ میں شادی کرنا ناپسند کرتے ہیں۔ چونکہ تجربہ نے ابتک یہی بات

بتائی ہے کہ شادی کے بعد تعلیم جاری رکھنا بہت دشوار طلب امر ہے۔ لیکن پرناچندر کے پاس یہ بھی دلیل نہ تھی۔ وہ اس لئے شادی کے مخالف نہ تھے کہ وہ طالبعلم تھے اور شادی کے بعد تعلیم پر اسکا ناخوشگوار اثر پڑتا ہے۔ وہ اس لئے بھی شادی کے مخالف نہ تھے کہ جب تک وہ چار پیسے اپنی قوت بازو سے حاصل کرنے کے لائق نہ ہو جائیں وہ ازدواجی زندگی میں نہیں آ سکتے۔ کچھ یہ بات بھی نہ تھی کہ شادی کے بعد فکر معیشت کے تردوات کا انہیں سامنا کرنا پڑتا۔ وجہ اگر کوئی تھی تو یہ اور جیسا کہ انہوں نے اپنے بعض بے تکلف دوستوں سے بیان بھی کیا کہ موجودہ زمانہ میں جیسی بیوی ملنی چاہئے ویسی ملنی مشکل ہے۔ انہوں نے مذہبی کتب میں دیکھا تھا کہ اگلے زمانہ کی بیویاں کس درجہ اطاعت شعار کتنی مطیع اور کیسی فرمانبردار ہوتی تھیں۔ برخلاف اس کے آجکل کے مشاہدات انہیں بتاتے تھے کہ بیوی شوہر کے لئے نہیں بلکہ شوہر دراصل بیوی کے لئے ہوتا ہے۔ شوہر اگر بیوی کی اطاعت شعاری اور فرمانبرداری نہ کرے تو ہر جگہ اور ہر سوسائٹی میں بدنام و مطعون ہوتا ہے۔ وہ کہتے کہ آجکل کی بیویاں عموماً پڑھی لکھی ہوتی ہیں اور اسکا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کھانا پکانا، کوٹنا پیسنا تو ایک علیحدہ چیز رہی، انہیں اپنے شوہر کو ایک گلاس پانی کا بھی دینا گراں گذرتا ہے۔ وہ اخبارات پڑھتی ہیں۔ انہیں عشقیہ ناولوں سے دلچسپی ہوتی ہے۔ وہ بناؤ سنگار میں اپنے وقت کا زیادہ حصہ صرف کرتی ہیں۔ اور ان کے دل میں شوہر کی عزت ایک ستم زدہ عاشق سے زیادہ نہیں ہوا کرتی۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ مساوات برتنا چاہتی ہیں۔ اور اگر انکے احکام کی تعمیل میں ذرہ برابر بھی بے عنوانی ہو تو پھر مرد کا انکے سامنے "سراسر تقصیر" ہو کر رہ جانا ناگزیر ہے۔

یہی خیالات تھے جنکی بناپر پرناچندر نے عرصہ ہوا یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ صنف نازک میں سے کسی فرد کو بھی اپنی زندگی کا شریک نہ بنائیں گے۔ لیکن بالآخر لوگوں کا اتنا شدید اور پیہم اصرار ہوا کہ انہیں اپنے فیصلہ میں کچھ ترمیم کرنی پڑی۔ انہوں نے سوچ لیا تھا اور یہ فیصلہ انکا اب بالکل قطعی تھا کہ اگر آئندہ شادی کے لئے انہیں مجبور کیا گیا تو وہ اپنی رضامندی ظاہر تو کر دیں گے۔ لیکن "عورت" کا انتخاب خود انکے ذمہ ہو گا۔

اتفاق یہ کہ پوجا کی تعطیل کے دو چار ہی دن قبل انہوں نے ہوسٹل کے بعض لڑکوں سے بھی اپنے خیالات کا اظہار کر دیا تھا کہ اول تو حتی الامکان وہ شادی ہی نہ کریں گے۔ اور اگر اسکا کبھی موقع آیا بھی تو ان کی نظر انتخاب اس عورت کی طرف جائیگی جو ظاہری و جسمانی ساخت کے لحاظ سے انتہائی بدقسمت عورت کہی جا سکے۔ یہ بات انکے خیال میں اچھی طرح جم گئی تھی کہ حسن ہی ایک وہ شئے ہے جس پر عورت کے سارے طلسم کا دار و مدار ہے۔

پرناچندر کی اس عجیب و غریب ذہنیت کو سن کر بعض لڑکوں نے انکا مذاق بھی اڑایا اور بعضوں نے کہا کہ صاحب کہنے اور کرنے میں بڑا فرق ہے۔ اس وقت کہہ لیجئے لیکن جب موقع آئے گا تو یہ ساری باتیں بھول جائے گا۔ پرناچندر نے اسکا اور کچھ تو نہ دیا صرف اتنا کہکر خاموش ہو گئے کہ آپ مانیں چاہے نہ مانیں لیکن کم از کم میں تو اپنے اپنے آپ کو اپنے ارادہ میں راسخ، اور اپنے "عہد" میں پختہ سمجھتا ہوں۔

الغرض یہ تھے وہ خیالات جو پرناچندر اپنی آئندہ زندگی کی نسبت رکھتے تھے۔ آجتک تو ان کی ماں نے دوست احباب کے ذریعہ سے انہیں سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن اس مرتبہ جب انہوں نے خود اپنی زبان سے اتنی آزادی و بیباکی کے ساتھ گفتگو کی تو پرناچندر سوائے "ہاں" کے "نہیں" کہنے کی جرأت نہ کر سکے۔ انہوں نے کہا "میں آپ کے حکم کی تعمیل کے لئے ہر وقت مستعد ہوں لیکن نہیں معلوم جس لڑکی کا آپ

ذکر کر رہی ہیں اسے کبھی آپ نے دیکھا بھی ہے یا نہیں؟" ماں کے لئے پرناچندر کی رضامندی بالکل غیر متوقع اور خلاف امید تھی۔ انہوں نے خوشی کے لہجہ میں جواب دیا۔ "نہیں میں نے بذات خود تو نہیں دیکھا لیکن سنتی ہوں بہت خوبصورت لڑکی ہے۔ ۱۳، ۱۴ سال کا سن ہے۔ پڑھی لکھی، سلیقہ مند، شگفتہ صورت، جب دیکھو یہی معلوم ہوتا ہے مسکرا رہی ہے۔"

کم سن! خوبصورت!! پڑھی لکھی!!! شگفتہ صورت!!!! پرناچندر کانپ اٹھے۔ ہر چندوہ اپنی ماں کی بڑی عزت کرتے تھے۔ لیکن اس وقت انہوں نے آزادی سے کہدیا کہ میں تو ایک ایسی لڑکی چاہتا ہوں جو ان اوصاف کے بالکل برعکس ہو۔ میں جدو بابو کے ہاں شادی نہیں کر سکتا۔ آپ انکی بیوی سے کہدیجئے۔

"تو کیا تمہارا یہ مطلب ہے کہ تم ایک بدصورت اور جاہل لڑکی چاہتے ہو؟" ان کی ماں نے حیرت واستعجاب کے لہجہ میں پوچھا۔

"ہاں" انہوں نے سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا "میں ایک حسین اور خوبصورت لڑکی سے شادی کرنے کے بالکل مخالف ہوں اور مجھے امید ہے کہ آپ بھی میری رائے کے موافق ہونگی"

"میں؟ میں کیوں ہونے لگی" ان کی ماں نے حالت اضطراب میں کہا "آخر تمہارا کیا مطلب ہے۔ تم صاف صاف کیوں نہیں کہتے" پرناچندر نے اختصار کے ساتھ اپنی دلیل پیش کی۔ ماں نے خیال کیا اس وقت گفتگو کا ملتوی رکھنا مناسب ہے۔ اور یہ کہتی ہوئی باہر چلی گئیں کہ "اچھا کم از کم تم شادی کے لئے تو راضی ہو گئے۔ جدو بابو کے یہاں نہ سہی، کہیں اور سہی"

(۲)

بابو جدو نندن سہائے کنگ پور ضلع بردوان کے ایک مشہور و معروف وکیل تھے۔ کلکتہ ہائی کورٹ میں پریکٹس کرتے تھے۔ انکی آمدنی تین چار ہزار روپے ماہانہ سے کم نہ تھی۔ خاندانی آدمی تھے۔ موروثی جائداد بھی اچھی تھی۔ ان کے صرف ایک لڑکی راجکماری تھی جو ماں باپ کی آنکھوں کا تارا تھی۔ راجکماری کا تیرھواں سال تھا۔ متعدد جگہوں سے شادی کے پیغامات آرہے تھے۔ لیکن جدو بابو کی نظر میں سوائے پرناچندر کے دوسرا نہ جچتا تھا۔ پرناچندر کے والد اور جدو بابو ہم جماعت تھے۔ اور خاندانی مراسم ایک زمانہ دراز سے چلے آتے تھے۔ پرناچندر کے والد کے مرنے کے بعد بھی جدو بابو نے اپنی وضع کو اسی طرح نباہا اور اپنے اوضاع واطوار میں کسی قسم کا بھی فرق نہ آنے دیا۔ پرناچندر کو وہ بہت عزیز رکھتے تھے اور ہمیشہ سے انکی پسندیدہ اطوار کے ثناخواں تھے۔ انکی سادگی اور مذہبیات سے دلچسپی انہیں اتنی پسند تھی کہ انکا خیال تھا کہ راجکماری کے لئے اگر کوئی بہترین رفیق زندگی مل سکتا ہے تو وہ پرناچندر ہیں۔

پرناچندر نے جب اپنی ماں سے صاف صاف انکار کر دیا کہ وہ جدو نندن بابو کے ہاں محض اس لئے شادی کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں کہ وہ ایک بدشکل اور بدصورت لڑکی چاہتے ہیں تو انکی ماں کو سخت پریشانی لاحق ہوئی۔ پرناچندر کا کالج کھل گیا تھا۔ وہ تو کلکتہ چلے گئے، لیکن غریب ماں کو سخت تشویش تھی کہ آخر وہ جدو نندن بابو کی بیوی کو کیا جواب دیں گی۔ چونکہ وہ ان سے یہ کہنا نہیں چاہتی تھیں کہ پرناچندر کچھ ایسی عجیب و غریب خواہش رکھتا ہے۔ اسی طرح آٹھ دن گذر گئے کہ یکایک جدو بابو کی بیوی پھر آموجود ہوئیں۔ تھوڑی دیر تک تو ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ اس کے بعد انہوں نے پھر وہی گفتگو شروع کی اور پوچھا کہ پرناچندر سے انہوں نے اس کا ذکر کیا یا نہیں؟ پرناچندر کی ماں اول تو

کچھ سراسیمہ ہوئیں لیکن آخر انہوں نے مناسب سمجھا کہ واقعہ کی اصل حالت سے انہیں من و عن آگاہ کر دیا جائے۔ تاکہ آئندہ وہ غلط فہمی میں مبتلا نہ رہیں۔ انہوں نے کہا: ''بہن بات یہ ہے کہ تم پرنا کے مزاج سے تو واقف ہی ہو۔ مذہبی کتابوں کو پڑھتے پڑھتے وہ بالکل سادھو ہو گیا ہے۔ پہلے تو وہ شادی کے لئے راضی ہی نہ تھا۔ لیکن میں نے بہت مجبور کیا تو یہ کہتے ہیں کہ وہ ایسی لڑکی سے شادی کریں گے جو حسین و شکیل ہونیکے بجائے بدصورت و بدشکل ہو۔ انہوں نے اس کے متعلق دلیل بھی پیش کی۔ میں کیا کہوں میری تو دلی خواہش تھی کہ میں اس نئے رشتہ کو جہانتک جلد ممکن ہو انجام دوں۔ لیکن اس صورت میں تم خود سمجھ سکتی ہو، میں کیا کر سکتی ہوں۔ میں نے تو حتی الامکان انہیں بہت سمجھایا لیکن وہ کسی صورت سے راضی ہی ہوتے نظر نہیں آتے۔ مجھے سخت افسوس ہے کہ میں اس حالت میں محض بے بس ہوں''

جدو بابو کی بیوی کو پرنا چندر کی اس دنیا سے نرالی خواہش کو سنکر حیرت تو ضرور ہوئی لیکن وہ خاموشی کے ساتھ ان کی ماں کی باتیں کو سنتی رہیں۔ پھر بولیں۔ ''پرنا کی یہی خواہش ہے تو کیا مضائقہ ہے۔ اس کا سب سے سہل طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنی آنکھ سے لڑکی کو دیکھ لیں۔ اگر انہیں پسند ہو تو شادی کر سکتے ہیں۔ اگر ناپسند ہو تو انہیں کوئی دباؤ دینے تو نہ جائے گا۔ بس میں جہانتک میں سمجھتی ہوں انہیں عذر نہ ہوگا''

''ہاں۔ اس میں تو انہیں کوئی عذر نہ ہونا چاہئے'' پرنا چندر کی ماں نے مایوسی کا سانس لیکر کہا۔ ''تو پھر آج ہی انہیں ایک خط لکھدو کہ وہ آئندہ اتوار کو کنگ پور براہ راست چلے آئیں اور لڑکی کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھکر کسی آخری نتیجہ پر پہونچیں''

(۵)

اتوار کا دن تھا۔ جدو بابو کے یہاں پرنا چندر کا بےچینی کے ساتھ انتظار ہو رہا تھا۔ صبح کی گاڑی سے آنے کی وجہ سے سب کو پریشانی تھی کہ آخر باوجود تار دینے کے پرنا چندر ابھی تک کیوں نہ آئے۔ کوئی کہتا، گاڑی چھوٹ گئی ہو گی۔ کوئی کہتا ممکن ہے کچھ سوچ کر ارادہ فسخ کر دیا ہو۔ کوئی کچھ کہتا، کوئی کچھ کہتا۔ اسی طرح سارا دن گذر گیا۔ شام ہو گئی۔ لیکن پرنا چندر نہ آئے۔ الغرض سب کو مایوسی ہو گئی تھی کہ یکایک شام کی گاڑی سے پرنا چندر تشریف لے آئے۔ ان کے آنے سے گھر میں پھر ہل چل ہو گئی نوکریاں اشارے کرنے لگیں۔ چھوٹے اور کمسن بچے نئے مہمان کو دیکھنے کی غرض سے باہر نکل آئے۔ جدو بابو کی بیوی کھانے پینے کے انتظام میں مصروف ہو گئیں۔

صبح کے وقت پرنا چندر اندر بلائے گئے۔ ایک وسیع کمرہ میں جہاں آرام و آسائش سے زیادہ عیش کا سامان موجود تھا انہیں بٹھایا گیا۔ یہ تکلفات پرنا چندر کی فطرت کے بالکل خلاف تھے۔ لیکن مجبوری یہ تھی کہ ان کی حیثیت ایک مہمان کی تھی۔ کچھ بول نہ سکتے تھے۔ دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہے تھے۔ اور نئی تہذیب اور مغربی تمدن کو کوس رہے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک لڑکی جو سر سے پاؤں تک سونے کے زیور میں لدی ہوئی تھی، کمرہ میں داخل ہوئی۔ وہ ایک نہایت بیش قیمت سرخ ریشمی ساری پہنے تھی۔ اس کے ہاتھوں میں ایک چاندی کا طشت تھا جس میں کچھ رنگترے، انگور اور انار کے دانے رکھے ہوئے تھے۔ لڑکی نے اس طشت کو پرنا چندر کے سامنے لا کر رکھدیا اور خود ذرا ہٹ کر علیحدہ ہو گئی۔ معلوم ہوا کہ یہی وہ لڑکی ہے جو پرنا چندر سے منسوب ہے۔ چونکہ لڑکی گھونگھٹ میں تھی اس لئے پرنا چندر تو نہ دیکھ سکے لیکن ہاتھ پیر کا اگلا حصہ جسے انہوں نے آتے وقت اتفاقیہ دیکھ لیا تھا اس سے انہیں اتنی بات معلوم ہو گئی تھی کہ لڑکی گوری یا سانولی نہیں بلکہ سیاہ فام ہے۔ یہ دیکھ کر انہیں یک گونہ تسلی ہوئی۔ لیکن جب تک وہ چہرہ نہ دیکھ لیتے انہیں اطمینان ہونا مشکل تھا نوکرانیاں

جوان معاملات میں بہت زیادہ قیافہ شناس واقع ہوئی ہیں انہوں نے فوراً ان کے چہرہ سے دل کی بات دریافت کر لی اور لڑکی کے چہرہ سے گھونگھٹ کو ہٹا دیا۔ پرناچندر نے اسے دیکھا اور تھوڑی دیر کے لئے بالکل محوِ حیرت ہو گئے۔ لڑکی قیاس سے باہر بدشکل تھی۔ اس کے سر کے بال کنگھی نہ کرنے کی وجہ سے الجھ الجھ کر سادھو کی جٹ کی طرح ہو گئے تھے۔ مدت کے بعد جو سر میں تیل پڑا تھا تو وہ پیوست ہونیکے بجائے پیشانی پہ بہہ رہا تھا۔ اسکی آنکھیں بڑی تھیں لیکن اتنی بڑی کہ دیکھنے سے بھیانک معلوم ہوتی تھیں۔ سیاہ چہرہ پر بڑے بڑے چیچک کے داغ اور اسپر بڑی بڑی سرخ آنکھیں۔ پرناچندر کی آنکھوں نے آجتک ایسا منظر نہ دیکھا تھا۔ ہونٹ اس قدر باریک کہ بند ہونے کی حالت میں ناک کی نوک سے ٹھوڑی تک بالکل ایک سطح نظر آتی تھی اور کوئی خط، کوئی نشیب و فراز درمیان میں ایسا نہ معلوم ہوتا تھا جس سے دہن کا وجود متعین کیا جا سکے۔ قد چھوٹا۔ قامت ناموزوں۔ بدن فربہ۔ ہاتھ پاؤں بدنما۔ الغرض وہ ایک ایسی ہستی تھی کہ اسے دیکھتے ہوئے قدرت پر ناانصافی کا الزام لگانا ہرگز ناروا نہ ہو سکتا تھا۔ یہ صرف بشریت کا تقاضہ تھا کہ پرناچندر بھی تھوڑی دیر کے لئے حیرت و استعجاب میں آ گئے تھے۔ ورنہ انکی خواہش کے مطابق لڑکی میں کل اوصاف بدرجۂ اتم موجود تھے۔

انہوں نے دل میں کہا۔ "بیشک میں اس لڑکی شریک رنج و راحت بنانے کی بنانے کی جرأت کر سکتا ہوں اس میں وہ کل اوصاف موجود ہیں، جسے پرناچندر کی آنکھیں مدت سے ڈھونڈھ رہی تھیں۔ یقیناً میں ایسی ہی لڑکی چاہتا ہوں۔ زبیر، شیونندن، رام سیوک، میرا مذاق اڑاتے تھے لیکن اب انہیں معلوم ہو جائے گا کہ دنیا میں اب بھی ایسے لوگ موجود ہیں، جو کہہ کے نہیں بلکہ کر کے دکھاتے ہیں۔ میں غلط کیوں کہتا۔ مجھے اس سے کیا فائدہ تھا۔ لیکن وہ لوگ کیوں یقین کرتے۔ اب انہیں یقین کرنا پڑیگا۔ مجبوراً ماننا پڑیگا"

تھوڑی دیر کے بعد انہوں نے اپنے جذبات پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے لڑکی سے پوچھا "تمہارا کیا نام ہے؟"

لڑکی نے اپنی گردن اونچی کی اور کچھ اس طور سے پرناچندر کو گھور کر دیکھا کہ انکی آنکھیں خود بخود نیچی ہو گئیں۔ پھر بولی۔ اسکی آواز اتنی گرجدار تھی کہ سارا کمرہ گونج رہا تھا۔ "کیا کہتے ہیں؟"

"تمہارا کیا نام ہے؟" پرناچندر نے سانس کو روکتے ہوئے دہرایا۔

"نام؟ .... کس کا نام؟ .... میرا؟ .... رجکماری ... نا... نا... نا ... جگدمبا"

"راجکماری۔ جگدمبا" دو نام۔ پرناچندر سوچنے لگے۔

عورتوں نے بتایا کہ پنڈتوں نے انکا نام جگدمبا رکھا تھا۔ لیکن گھر والے انہیں راجکماری کے نام سے پکارتے ہیں۔

پرناچندر نے دل میں کہا "راجکماری یہ نام نامناسب ہے۔ اگر شادی ہوئی تو میں اسی اصلی نام کو رواج دونگا جو مقدس پنڈتوں نے تجویز کیا ہے۔ یہ مذہبی نام ہے اور اگلے وقتوں میں عورتوں کے ایسے ہی نام ہوتے تھے۔ جگدمبا کیسا پیارا اور کیسا بھلا نام ہے"۔

لڑکی اندر بلا لی گئی۔ پرناچندر سے دریافت کیا گیا کہ وہ اس نسبت کو پسند کرتے ہیں یا نہیں؟ انہیں کیا عذر ہو سکتا تھا۔ انہوں نے اثبات میں جواب دے دیا۔

(۶)

اسی دن شام کو پرناچندر رخصت ہوئے۔ تانگہ تیزی کے ساتھ گذر رہا تھا۔ پرناچندر اپنے خیالات میں مستغرق تھے۔ خیالات کا طوفان تھا

جو اڈا چلا آرہا تھا۔ وہ اپنی فتح پر خوش تھے لیکن ساتھ ہی انکے قلب کی کچھ عجیب حالت تھی۔ دل اندر ہی اندر بیٹھا جارہا تھا۔ اور رہ رہ کر جگدمبا کی خوفناک صورت ان کی آنکھوں میں گھوم رہی تھی۔ انہوں نے آج اپنی عادت بلکہ فطرت کے خلاف ان عورتوں کو غور سے دیکھا جو انہیں راستہ میں گذرتی ہوئی ملیں۔ ان کی آنکھیں بے اختیارانہ نامحرم عورتوں کے چہرہ پر پڑرہی تھیں۔ اور وہ یہ سوچ رہے تھے کہ ان میں کیا کوئی ایک عورت بھی جگدمبا کی شکل وصورت کے مشابہ ہے۔ لیکن باوجود تلاش وکوشش کے بھی انہیں کوئی عورت جگدمبا کی شکل وشباہت کی نظر نہ آئی تھی۔

ماں سے ملکر اور اتنا کہنے کے بعد کہ انہوں نے شادی کے لئے اپنی رضامندی ظاہر کردی ہے، وہ کلکتہ چلے آئے۔ ہوسٹل میں آتے ہی لڑکے ان کے اردگرد جمع ہوگئے۔ چونکہ کنگ پور جاتے وقت پرناچندر نے لڑکوں سے واقعہ کی اطلاع دیدی تھی۔ کسی نے پوچھا "کہئے پرنا بابو کیا خبر ہے؟" پرناچندر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "میاں زبیر سے پوچھئے۔ انہیں کسی طرح یقین نہ آتا تھا" ایک نے پوچھا۔ "لڑکی آپ کو پسند ہے؟" کسی نے دریافت کیا "وہ سن کیا ہوگا؟" غرض چاروں طرف سے سیکڑوں سوالات ہونے لگے۔ پرناچندر وقار وتمکین کے ساتھ سب کا جواب دیتے جاتے تھے اور اپنی فتح پر بیحد مسرور نظر آتے تھے۔ اتفاقاً کسی نے پوچھا "اور لڑکی کا نام کیا ہے؟" پرناچندر نے سنجیدگی کے ساتھ کہا "جگدمبا"

یہ نام سنکر ہنسی تو سبھی کو آگئی لیکن شیونندن کھل کھلا کر ہنس پڑا۔ "واقعی پرنا بابو بہت اچھا نام ہے۔ واقعی بہت اچھا ہے"۔

نگندر بابو نے بناوٹی غصہ سے شیونندن کو ڈانٹا "نہایت بیہودہ ہو۔ تمہیں کبھی تمیز نہ آئے گی"۔

شیونندن نے ہنسی کو ضبط کرتے ہوئے کہا:۔

"نہیں میں کیوں ہنسنے لگا۔ تم خواہ مخواہ الزام لگاتے ہو" لیکن یہ کہتے کہتے آخر اس سے ہنسی برداشت نہ ہوئی اور بستر پر مارے ہنسی کے لوٹ گیا۔

جوگندر بابو نے کہا "آخر آپ لوگوں کو یہ نام کیوں نیا معلوم ہوتا ہے۔ شریف گھرانوں میں عورتوں کے ایسے ہی نام رکھے جاتے ہیں۔ اس میں اچنبھے کی کون سی بات ہے۔ آپ لوگ تو تھیٹر کے ناموں کو پسند کرتے ہیں۔ یہ کون؟ فیروزی۔ یہ کون؟ بسنت دیوی یہ کون؟ سمری متی منجری۔ واہ واہ، کتنے اچھے نام ہیں۔ آپ لوگوں کو شرم نہیں آتی"۔

(۷)

یہ تو خیر اسی وقت کا واقعہ ہے جب پرناچندر کے ہوسٹل میں داخل ہوتے ہی لڑکے ان کے چاروں طرف جمع ہوگئے تھے۔ لڑکوں کے جانے کے بعد جب ذرا تنہائی ہوئی تو پرناچندر پھر اپنے خیالات کی سیر کرنے لگے۔ جگدمبا کی شکل ان کی آنکھوں میں پھرنے لگی اور وہ سوچنے لگے کہ کیا قدرت بھی ایسی مہیب صورت انسانی شکل میں پیدا کرسکتی ہے۔

دوسرے دن ان کی ماں کا خط آیا کہ شادی کی تاریخ اسی مہینہ میں رکھی گئی ہے۔ اور شادی سے دو دن قبل انہیں مکان پہنچنا ہوگا۔

اگرچہ انہوں نے خود ہی اپنی رضامندی شادی کے لئے ظاہر کی تھی اور انہیں معلوم تھا کہ شادی بھی عنقریب ہوگی لیکن اس خط کو دیکھتے ہی انکا دل بیٹھنے لگا اور کچھ ایسی حالت طاری ہوئی جسکا بیان مشکل ہے

دو چار دن تک تو یہ کالج گئے بھی لیکن رفتہ رفتہ ان کے معمولات میں فرق آنے لگا۔ یہاں تک کہ صبح کا اشنان اور پوجا پاٹ بھی تین تین چار چار دن تک ناغہ ہونے لگا۔ انکی نیند اڑ گئی تھی۔ کھانے پینے کی مطلق خواہش نہ رہتی تھی۔ وہ ہمیشہ بستر پر پڑے رہتے تھے اور خدا معلوم کن کن خیالات کی سیر کرتے تھے۔ وہی ایک خیال، ایک تصور، ان کے دماغ کی آزادی کو معطل کر رہا تھا، اور وہ لاکھ خیالات کو تبدیل کرنا چاہتے تھے لیکن یہ نہ ہوتا تھا۔ جگدمبا کی شکل ہر وقت، ہر لحظہ انکے سامنے تھی اور انہیں کسی طرح بھی اس سے نجات نہ ملتی تھی۔

(۸)

شادی کی مقررہ تاریخ کو صرف پانچ دن باقی رہ گئے تھے۔ رات کا وقت تھا۔ کائنات پر ایک سکون مطلق طاری تھا۔ دنیا بے خبر سوتی تھی لیکن ایک ہستی صرف پرناچند کی تھی جس کی آنکھوں میں نیند نہ تھی۔ وہ بستر پر کروٹیں بدل رہے تھے۔ کبھی اٹھتے کبھی بیٹھتے، کبھی ٹہلتے، کبھی کراہتے لیکن کسی طرح طبیعت کو کل حاصل نہ ہوتا۔ وہ پریشان تھے۔ خود اپنے اوپر حیران تھے "یا پرمیشور میری یہ کیا حالت ہے؟ میرا دل کیوں بیٹھا جاتا ہے؟ میں ایسا کیوں پاگل ہو گیا ہوں؟ یا پرمیشر، یا بھگوان تو میری مدد کر۔ میرے قلب کو اطمینان دے۔ میری طبیعت کو سکون عنایت کر۔ مجھے موت دے، اگر تو میری مدد نہیں کر سکتا۔ میری زندگی کو ختم کر دے، اگر تو مجھ سے ناخوش ہے۔ میری جان لیلے اگر میرے گناہ معاف نہیں ہو سکتے"

صبح کاذب کا وقت تھا کہ تھوڑی دیر کے لئے انکی آنکھ لگ گئی۔ اب اسے خیالات کا اثر کہو یا دماغی انتشار کا نتیجہ سمجھو انہوں نے خواب دیکھا کہ ایک وسیع میدان میں تنہا کھڑے ہیں، صحرا پر خار ہے اور راستہ نامعلوم۔ کہاں جائیں؟ کدھر جائیں؟ وہ یہ سوچ رہے تھے۔ ناگاہ ایک خوفناک درندہ ان پر حملہ آور ہوا۔ انہوں نے بھاگنا چاہا، لیکن یہ جانور قریب آگیا اور انہوں نے دیکھا کہ اسکا چہرہ بالکل جگدمبا کے مشابہ ہے۔ قریب تھا کہ جانور انہیں اپنی سینگوں سے اٹھا کر پھینکدے کہ انہوں نے ایک چیخ ماری اور ساتھ ہی آنکھ کھل گئی۔ روشنی گل ہو گئی تھی۔ تمام اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ دس منٹ تک تو وہ بے حس و حرکت بستر پر پڑے رہے۔ پھر تکیہ کے نیچے سے دیا سلائی نکال کر لالٹین روشن کی اور دیر تک خواب کی تعبیر کو سوچتے رہے۔

دن رات کے چوبیس گھنٹے تیزی سے گذر رہے تھے۔ یہانتک کہ اب صرف دو دن پرناچند کی روانگی کو باقی رہ گئے۔ دن کا وقت تھا لیکن مسلسل کئی راتوں کی شب بیداری کے باعث فطرت نے انہیں پھر تھوڑی کے لئے دنیا سے بے خبر کر دیا تھا۔ غنودگی کا طاری ہونا تھا کہ انہوں نے پھر ایک خواب دیکھا جو اگلے خواب سے زیادہ وحشت ناک، اور ہولناک تھا انہوں نے دیکھا کہ ایک تنگ و تاریک کمرہ میں جسکی دیواریں بجائے سفیدی کے خون سے رنگی ہیں، وہ مقید ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد "کالی دیبی" ایک ہاتھ میں چھرا اور دوسرے ہاتھ میں ایک کٹا ہوا سر جس سے تازہ خون ٹپک رہا تھا، انہیں اپنی طرف آتی ہوئی دکھائی دی۔ انہوں نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ "کالی دیبی" کی موجودہ شکل بالکل جگدمبا کے مشابہ ہے اور وہ کٹا ہوا سر جسے وہ اپنے ہاتھوں میں لئے ہے خود انکی صورت سے مماثلت رکھتا ہے۔

شت کے عالم میں ان کی آنکھ کھل گئی۔ لیکن دیر تک سینہ بلیوں اچھلتا رہا۔

انہوں نے سوچا۔ ماں کو لکھدوں۔ شادی منقطع کر دیجئے مجھے پسند نہیں۔ اس خیال کا آنا تھا کہ انہوں نے دوات قلم نکال کر خط
نا شروع کیا۔ متعدد مسودے بنائے اور چاک کئے۔ لیکن ایک سطر بھی نہ لکھی گئی۔ یہ بات نامناسب ہے۔ شادی کے کل انتظامات ہو گئے ہونگے
ں خوشی خوشی چیزوں کی فراہمی کر رہی ہونگی۔ انہیں کیا معلوم کہ یہاں پرناچندر پر کیا بیت رہی۔ لیکن بہر حال امتناعی خط لکھنا مناسب
ں ہے۔ ماتا کو تو صدمہ ہو ہی گا۔ مجھے بھی لوگ کمینہ اور چھچھورا متصور کریں گے۔ نہیں ایسا نہ ہوگا۔ اور میں ایسا خط نہ لکھونگا۔

الات کا طوفان تھا جو امڈا چلا آرہا تھا۔ جب اس صورت بھی ناامیدی ہوئی تو انہوں نے فیصلہ کیا کہ کلکتہ چھوڑ کر کسی دوسرے شہر میں جانا زیادہ
سب ہے لوگ سمجھیں گے، گنگاجی اشنان کے لئے گئے ہوں گے۔ پیر پھسل گیا ہوگا ڈوب گئے ہونگے۔ گھر خبر ملیگی، لوگ رو پیٹ کر خاموش
جائیں گے۔ مجھے تو کم از کم دماغی تکلیف و روحانی اذیت سے نجات حاصل ہو جائے گی۔ یہ خیال اتنا مستحکم اور یہ تدبیر اتنی مناسب تھی کہ
وں نے فوراً سامنے کی میز سے ٹائم ٹیبل اٹھایا اور بمبئی جانیکا وقت دیکھنے لگے۔ بمبئی کلکتہ سے بہت دور ہے۔ وہاں پرناچندر کو کون پہچانتا
۔ رزق کے مالک بھگوان ہیں۔ اس کا کیا تردد ہے۔ وہاں اطمینان سے زندگی بسر ہوگی۔ رہی ایک ماں کی خیریت سو کسی طرح معلوم
لی جائے گی۔

دماغ آخری نتیجہ پر پہونچ گیا۔ کمرہ بند کر کے یہ اپنا بستر باندھنے لگے۔ زیادہ چیزوں کا لے جانا مناسب نہیں ہے۔ اس سے تو بات
وم ہی ہو جائے گی۔ لوگ تلاش میں نکلینگے۔ خدا معلوم کہاں کہاں ڈھونڈیں گے۔ اخبارات میں اشتہارات شایع کریں گے۔ اس سے
بدنامی و رسوائی ہوگی۔ نہیں نہیں میں تنہا جاؤنگا۔ اکیلا جاؤنگا۔ سب چیزوں کو یہیں چھوڑوں گا۔ اس خیال کا آنا تھا کہ انہوں نے بستر وغیرہ
ل ڈالا۔ ابھی صرف آٹھ بجے ہیں۔ گاڑی دو بجے چھوٹتی ہے۔ بہت وقت ہے۔ گیارہ ساڑھے گیارہ بجے چپ چاپ نکل جاؤں گا۔ کسی
بر بھی نہ ہوگی۔

گیارہ بجگئے۔ ان کا دل دھڑکنے لگا۔ کیا میں بمبئی چلا جاؤں؟ زندہ ہو کر مردہ بنجاؤں؟ غریب ماں رو رو کر مرجائے گی۔ اسکا پاپ
ں کے سر پڑیگا۔ میرے ہی سر پڑنا؟ میں کتنا پاپی ہوں۔ کیا سوچتا ہوں۔ نہیں نہیں۔ یہ بات نہ ہوگی۔ ہرگز نہ ہوگی۔ میں ایسا نہ
وں گا۔ کبھی نہ کردوں گا۔

شادی کے معنے خوشی و شادمانی کے ہیں لیکن پرناچندر کی شادی درحقیقت سو مصیبتوں کی ایک مصیبت تھی۔ انکا دماغ جواب
ے رہا تھا۔ ان کے قلب کی حالت بگڑی جاتی تھی۔ اور انہیں اس مصیبت سے نجات دلانے والا کوئی بھی نظر نہ آتا تھا۔

آخرکار پرناچندر کے یہ کل خیالات عارضی ثابت ہوے۔ اور انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ جو کچھ بھی ہو وہ اب تو زبان ہار چکے ہیں اور انہیں
ہر نتیجہ کو برداشت کرنا ہی ہے۔

(۹)

وقت مقررہ پر پرناچندر اپنے مکان پہونچ گئے۔ بارات نہایت ہی تزک و احتشام کے ساتھ کنگ پور کی طرف روانہ ہوئی۔ اسوقت

پرنا چندر کے دل میں نہ خوشی کے جذبات تھے اور نہ غم کے۔ خوف و ہراس کا بھی تسلط دل سے اٹھ گیا تھا۔ میدان جنگ میں قاعدہ ہے کہ بزدل سے بزدل سپاہی بھی اپنی موت کو بھول جاتا ہے۔

رسم کے مطابق دولہا دولھن ایک جا بٹھائے گئے اور رونمائی کے لئے ایک بڑا آئینہ لایا گیا۔ پرنا چندر کو دلھن کی صورت دکھائی گئی۔ لیکن ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب انہوں نے دیکھا کہ بجائے کریہ صورت جگدمبا کے ایک کمسن دبلی پتلی اور پری جمال لڑکی ان کے پہلو میں بیٹھی ہے۔

بعد میں خود راجکماری ہی کی زبانی معلوم ہوا کہ وہ لڑکی (یعنی جگدمبا) دراصل محلہ کے ایک تیلی کی تھی جو قصداً اس لئے دکھائی گئی تھی کہ کسی طرح ان کی یہ عجیب و غریب ذہنیت بدل جائے۔

اب تو یہ حالت ہے کہ پرنا چندر کی آنکھیں ہوسٹل کے دروازہ پر لگی رہتی ہیں "وہ ابھی تک ڈاکیہ نہیں آیا۔ خدا معلوم کہاں ہے بہت دیر ہو گئی" ایک دن بھی خط نہیں آتا تو پرنا چندر بےچین ہو جاتے ہیں۔

ظہیر الدین حیدر (آروی)

چند باتوں کا خیال رکھئے

(۱) نگار کی تاریخ اشاعت ہر چند ہر ماہ کی پندرہ تاریخ ہے، لیکن عموماً وہ پہلے ہی ہفتہ میں شایع ہو جاتا ہے، اس لئے اگر ۲۰ تاریخ تک پرچہ نہ پہونچے تو فوراً اطلاع دیجئے۔ ورنہ پھر دوسری کاپی مفت نہ مل سکے گی۔

بعض حضرات دوسرے مہینہ کا پرچہ ملنے پر پہلے مہینہ کا پرچہ نہ پہونچنے کی شکایت کرتے ہیں، افسوس ہے کہ ان شکایات کا ہمارے پاس کوئی جواب نہیں

(۲) نمبر خریداری کتابت میں درج کرنا ضروری ہے، بعض حضرات ڈاکخانہ کے نمبر ایک سو ۱۱۰ کو اپنا خریداری نمبر سمجھتے ہیں، نمبر خریداری قیمت کے دیر داہنی جانب بلو بلیک روشنائی سے درج ہوتا ہے اس کو ایکبار دیکھ کر تعین نوٹ فرمائیے۔

(۳) طلبہ کے لئے زیادہ مناسب یہ ہے کہ وہ اپنے گھر یا کسی اور پتہ سے رسالہ طلب کریں۔ اسکول کے پتہ سے رسالہ طلب کرنا محفوظ طریقہ نہیں ہے

(۴) جن طلبہ یا لائبریریوں وغیرہ سے رعایتی چندہ لیا جاتا ہے وہ اگر میعاد خریداری ختم ہونے پر منی آرڈر روانہ کریں گے تو وی۔ پی پوری رقم کا کیا جائے گا۔

(۵) حیدرآباد کے ان خریداروں سے جہاں انگریزی ڈاکخانہ نہیں ہے، یہ استدعا کیجاتی ہے کہ حتی الامکان رسالہ رجسٹرڈ طلب کریں اور ۱۲؎ سالانہ اس صرف کو بھی برداشت کریں کیوں کہ سوائے اس کے کوئی صورت وہاں رسالہ پہونچنے کی نہیں ہے۔

منیجر "نگار" لکھنؤ

فلسفہ مذہب

مذہب اور عبادات

معمولات مذہب کا تعلق مذہب سے ویسا ہی ہے جیسا انسان کا تعلق اسکی اپنی عادات سے جس طرح عادات کا یہ خاص عمل ہے کہ
انسانی جسم دقوار میں ایک قسم کا قرار وسکون ڈالدیں تاکہ ان میں دماغ کے معمول بننے کی صلاحیت پیدا ہو اسی طرح معمولات مذہب کا
کام یہ ہے کہ مذہب کو آئین معاشرت میں مقیم و متعین کرنے کے لئے اعمال انسانی کا ایک ایسا نظام یا ترتیب مقرر کرے جس سے علاوہ اس کے
کہ جماعت میں تشکیل یا تنظیم پیدا ہو سکے وہ انسان کی خواہش اور ارادے کو روحانیت کی طرف منتقل کردیں۔ بغیر معمولات مذہبی
کے انسان کے اندر عملی مذہب کی صورت پیدا کرنا ممکن نہیں اور بقول علمائے نفسیات مذہب کی فطرت کا ایک نظام عمل اور دستور
کے ماتحت ہونا لازم ہے اور تاکہ ایک مذہب کے ماننے والوں کے اندر باہمی تعلقات و روابط قائم و وابستہ رہیں یہ ضرور ہے کہ مذہب میں
کچھ نہ کچھ ظاہری معمولات ہوں۔ معمولات مذہبی کی ایک صورت مراسم مذہبی ہے اور وہ تاریخی حیثیت سے اس سے زیادہ عمیق نتیجہ پیدا
کرتی ہیں جتنا معمولات مذہب۔

تقریباً دنیا کے جتنے مذاہب ہیں ان کے عموماً مراسم مذہب کو بجائے خود ایک ایسا زود اثر نسخہ مانتے ہیں جس سے انکی دلی منتیں اور
مرادیں پوری ہو جاتی ہیں جو رکاوٹیں پیدا ہونے والی ہوں وہ اس سے دور ہو جائیں قبل اس کے کہ ہم ان مراسم کی ابتدا پر غور کریں
ضروری ہوگا کہ بعض اعلی مذاہب میں ان خیالات کی تشریح کردیں جو ان رسمیات کے متعلق ہیں۔ عموماً ان خیالات کے اندر دو مقصد پنہاں
ہوتے ہیں۔ اول تو یہ مراسم کا ادا کرنے والا اس بات کو باور کرتا ہے کہ اسکی جو کچھ دلی آرزوئیں اور منتیں ہوں اور جس کی خواستگاری میں اسکو
دلی درخواست پر شبہ ہوتا ہے کہ اس کو ملے یا نہ ملے وہ ان مراسم کے انجام دینے کے بعد زیادہ تیقن سے بدل جائے دوسرا مقصد ان
مراسم کی ادائیگی سے یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسا ذریعہ سمجھے جاتے ہیں جس سے عابد و معبود میں یگانگت پیدا ہو سکے۔

اگر مذاہب عالم کے عام معمولات و رسمیات پر غور کیا جائے تو انکی فہرست حسب ذیل اعمال کے اندر آجاتی ہے۔

۱۔ طہارت ۲۔ قربانی چڑھانا ۳۔ بخور جلانا یا ہون کرنا ۴۔ نماز ۵۔ روزہ ۶۔ زکوۃ ۷۔ اجتماع ہم مذہب افراد
مختصراً ہم ان اعمال کے کنہ و فیہ پر ایک مبصرانہ نظر ڈالیں گے۔

طہارت طہارت مذہبی کا مقصد یہ ہے کہ بعض عمل ظاہری سے ایسی گندگی اور پلیدی کو دور کیا جائے جو ایک جماعت یا ایک
انسان میں یا ایک مقام پر پیدا ہو جاتی ہے اور جسکا لازمی نتیجہ بیماریاں۔ تکالیف اور موت ہیں مذہب کی ارتقائی حالت
میں یہ خیال صفائی قلب و باطن اور گناہوں سے محفوظ رہنے کی صورت میں بدلتا گیا اور جو فرق ظاہری و باطنی صفائی کا ان دونوں خیالات

کے دوران ارتقاء میں پیدا ہوا وہ ایسے مذاہب مثلاً یہود، نصاریٰ یا ہنود و مجوس یا اہل یونان و روما میں بالکل نہیں پایا جاتا، اور گناہوں کو دھونے کے لئے جو ظاہری اور جسمانی طہارت کی ان مذاہب میں ہدایت ہے اور جس کے لئے اصطباغ، گنگا اشنان وغیرہ کا استعمال ناگزیر سمجھے جاتے ہیں وہ صفائی قلب اور گناہوں کے محو کرنے میں ویسی ہی کار آمد ہیں جیسا توبہ و استغفار۔ اسلام نے یا موجودہ زمانے کے بعض ترقی یافتہ مذہبی سوسائٹیوں نے صفائی قلب کے لئے ظاہری طہارت کو صرف ایک ذریعہ سمجھ کر محض اعمال انسانی کو کافی سمجھا ہے۔ اور ان مذاہب میں طہارت کوئی خاص مقصود بالذات عبادت سمجھی نہیں جاتی۔ بلکہ عبادت کے لئے طبیعت کو مطمئن ساکن کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ ناپاکی سے عموماً طبیعت پراگندہ اور مشوش رہتی ہے اور غسل بدن سے اور جگہ کی صفائی اور لطافت سے آدمی مطمئن و بشاش ہو کر خدا کی عبادت زیادہ رجوع قلب سے کرتا ہے۔ مسلمانوں میں اسیواسطے طہارت کی ضرورت اسوقت تک فریضہ مذہبی نہیں سمجھا جاتی جبتک کہ اس کے بعد خدا کی عبادت نہ کی جائے۔

ابتدائی خیالات انسانی نے مذہبی ناپاکی کے خاص ذرائع۔ موت، مباشرت، بیماریاں، ہر قسم کے خون (خصوصاً حیض و نفاس کے خون) کے نکلنے کو جانا ہے اور ایک پاک انسان کا اس قسم کی ناپاکیوں سے ملوث ہو جانے کے بعد اس کے لئے ضروری ہوتا تھا کہ وہ مذہبی طہارت کو عمل میں لائے۔ یہ مذہبی طہارت اکثر تو اس خیال پر مبنی ہوتی تھیں کہ پلیدی ارواح خبیثہ کے سایہ سے پیدا ہوتی ہیں اور اس لئے ان ارواح کو نکالنے یا انکے اثر کو دور کرنے کے لئے کچھ خاص قسم کے منتروں کا جپنا بھی ضروری ہوتا تھا جس سے پاک روح خوش ہو کر ناپاک روح کو نکالنے پر آمادہ ہو جائے جو ناپاک مقام پر آکر اپنا ڈیرہ جما لیتی ہیں۔ کیونکہ ابتدائی عقول انسانی کا ہر جگہ یہ خیال رہا ہے کہ بیماریاں اور خصوصاً دماغی بیماریاں ناپاک ارواح کے حلول اور اثر سے پیدا ہوتی ہیں۔ انسانی عقل نے جب زیادہ ترقی کی تو ان بیماریوں کو دور کرنے کے لئے اس نے دواؤں کا استعمال بھی شروع کیا۔ مگر ایک زمانہ تک اسکا خیال رہا کہ دوائیاں کوئی اپنی ذاتی خاصیت رکھنے کی وجہ سے اثر نہیں کرتیں بلکہ وہ ایک قسم کے طلسمی جوہر ہیں جو پیٹ میں جاکر اپنے طلسمی قوت کے کرشمے دکھلاتی ہیں۔

طہارت مذہبی کی بعض صورتیں جو مختلف اقوام میں پائی جاتی ہیں ان کی یہاں پر ایک فہرست دینا نامناسب نہوگی گو کہ یہ فہرست حاوی نہیں۔

۱۔ پانی سے عضو جسمانی کو غسل دینا جو پانی پہلے سے بابرکت کر لیا گیا ہو کسی چیز کے ڈالنے سے یا اس پر کچھ دعا پڑھنے سے۔ مثلاً عیسائیوں میں اصطباغ، ہندوؤں میں گنگا اشنان۔

۲۔ گائے کے پیشاب سے عضو جسمانی کو دھونا (ہندوؤں اور پارسیوں کا طریقہ)

۳۔ قربانی کا خون چھڑکنا۔

۴۔ بخور و لوبان کی دھونیاں دینا۔

۵۔ بعض چیزیں مثل گندھک اور سیندور یا زیتوں کے تیل کو سر یا پیشانی پر ملنا۔

۶- آگ سے جلانا۔

۷- بعض منتروں کا جپنا جس کی وجہ سے پلید روح نکل جاوے۔

۸- کسی ایسی چیز پر نگاہ ڈالنا جس سے ناپاکی خود بخود دور ہو جائے (جیسے پارسیوں میں کتوں کو دیکھنا)

۹- مکانوں میں پھونکی ہوئی کیل گاڑنا۔

۱۰- بعض اشیاء مثلاً نمک۔ شراب۔ سرکہ وغیرہ کا اندرونی استعمال۔

۱۱- عورتوں کی مقاربت سے پرہیز کرنا۔

۱۲- آگ کے اندر سے گزرنا۔

۱۳- اپنے بدن کو ریت یا مٹی سے ملنا۔ بدن کو داغنا یا اسپر نشان بنانا۔ موٹے جھوٹے کپڑے میں اپنے کو لپیٹنا

۱۴- عقیقہ کرنا۔

۱۵- ختنہ کرانا۔

۱۶- بعض اشیائے ماکولات سے پرہیز کرنا۔

دنیا کے اکثر موجودہ مذاہب میں بعض یہ صورتیں طہارت مذہبی کی پائی جاتی ہیں مگر غالباً اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس نے طہارت مذہبی کی ضرورت کو ایک حد تک تسلیم کرتے ہوئے اسکو جسمانی صفائی کا ذریعہ جان کر عبادات کا پیش خیمہ بنایا ہو۔ اور اس کا مدعا ایسی طہارت سے سوائے موجودہ طبّی اصول صفائی و حفظان صحت کے کچھ نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں میں ختنہ۔ عقیقہ اور حج کے مراسم میں بعض ایسی طہارت مذہبی کا رواج پایا جاتا ہے جس کی ابتدا ارواحی اوہامی خیالات سے ہوئی ہے جو اور مشرک اور وحشی اقوام میں پائے جاتے ہیں۔ مگر یہ سب عرب کے قومی اور قدیم مراسم ہیں انکا ذمہ دار دین اسلام نہیں جو قرآن میں ہے ان مراسم کا مٹانا قرآن کا کوئی مشن نہ تھا۔ اور نہ قرآن کا یہ منشا ہے کہ عربوں کی قومی عادات و رسمیں اسلام کے ساتھ دوسری قومیں بھی اختیار کریں۔ قرآن نے صرف اس عقیدے کو مٹا دیا ہے کہ اس قسم کی جسمانی طہارت سے بجز اس کے کہ عبادات میں ایک قسم کی یکسوئی و اطمینان و انبساط قلب حاصل ہو وہ گناہ دھونے کے لئے کوئی مقصود بالذات شئے نہیں[1]۔ اور اسلام میں ناپاکی کی تعریف وہی ہے جو حضرت مسیحؑ

[1] غسل جنابت کی فرضیت اور بغیر اس کے نماز کا قبول نہونا۔ ایک عرصہ تک مجھے بھی اسکی علت سمجھ میں نہ آئی اور میں یہ سمجھا کرتا تھا کہ کہیں قرآن کا یہ منشا تو نہیں کہ آدمی پر یہ ناپاکی ارواح خبیثہ کے مساس سے پیدا ہوتی ہے لیکن ایک روز ایک انگریزی ڈاکٹر کا ایک مقالہ مباشرت پر پڑھ رہا تھا۔ اسکا قول ہے کہ مباشرت کے بعد بدن کو سکون و راحت دینا نہایت ضروری ہے ورنہ خوف ہے کہ انسان ایسا کرنے پر جلد یا بدیر نامرد ہو جائے یا اوسکو دماغی اور اعصابی امراض پیدا ہو جائینگے اور اسنے یہ مشورہ دیا ہے کہ یا تو مباشرت کے بعد سو جانا چاہئیے یا ٹھنڈے پانی سے غسل کر ڈالنا چاہئیے کہ اعصاب میں جو ہیجان پیدا ہوتا ہے۔ وہ رفع ہو جائے۔ اس وقت مجھے غسل جنابت کی مصلحت سمجھ میں آئی۔ (س۔م۔ا۔)

کی طرف سے انجیل میں منقول ہے۔ یعنی ہر وہ چیز جو انسانی اعضاء سے خارج ہو کر نکلے وہ ناپاک ہے اور اس میں بول و براز۔ خون۔ پیپ حیض و نفاس۔ کھنکھار (اور ایک حد تک تھوک اور پان کی پیک) سب شامل ہیں۔ ناپاکی کا یہ معیار بہت ہی اچھا ہے ورنہ طبیعتوں کے اختلاف سے یہ مشکل امر تھا کہ بدی و نیکی کی طرح ناپاکی کا بھی کوئی معیار مقرر کیا جائے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ نفاست طبیعت۔ صفائی اور حفظان صحت کا تقاضا ہے کہ اس پلیدی کو پہلے کپڑے یا جسم سے دور کیا جائے اور پھر خدا کی عبادت میں مصروف ہوا جائے۔ ورنہ اس کے بغیر عبادت نامقبول۔ اس سے زیادہ قرآنی طہارت کا اور کوئی مدعا نہیں۔

طہارت کے ضمن میں بعض قسم کے ماکولات (خصوصاً جانوروں کے گوشت) بھی شامل ہیں۔ وہ بھی مذہبی نقطۂ نظر سے دیکھے گئے ہیں۔ جہاں تک قرآن کا تعلق ہے کھانوں میں ناپاک چیزیں وہی ہیں جو انسانی صحت کو نقصان پہونچانے والی ہیں۔ اور انہیں ہر قسم کی نشہ آور چیزیں۔ خون و مردار ہیں جنکے استعمال سے بدن میں مفسد مادہ پیدا ہونا یا اوسکا اندیشہ ہونا اصول طب کے مسلمات میں سے ہے۔ اگرچہ قرآن نے سڑی گلی اور بدبودار چیزوں کو حرام نہیں کیا لیکن مذہبی اصول کا کوئی مطلب و مدعا ہے تو ان چیزوں کا حرام ہونا ویسا ہی ضروری تھا جیسے سور کا گوشت۔ مگر قرآن نے دم اور میتہ اور لحم الخنزیر کو مذہباً حرام قرار دیا ہے۔ مگر سڑے گلے پھلوں کو جس کو مومنین بوجہ افلاس کے زیادہ کھا کر ہیضہ کا شکار ہو جایا کرتے ہیں اسکو مذہباً حرام قرار نہیں دیا۔ حالانکہ سور کا گوشت عام طور سے ایسا مضر صحت نہیں جیسا یہ چیزیں ہیں۔ عرب کی آب و ہوا میں مضر ہو تو ہو ورنہ اہل یورپ اسکا متواتر استعمال کرتے ہیں اور انکی صحت و اخلاق پر اسکا کوئی مضر اثر نہیں پڑتا۔ اور نہ دیکھا گیا۔ بس معلوم ہوا کہ مذہب کا مدعا نہ صرف حفظان صحت ہے بلکہ اس سے زیادہ کچھ اور ہے۔ یورپ کے لال بجھکڑوں نے تو یہودیوں کی فہرست حلال و حرام ماکولات کو جو کتاب تثنیہ میں ہے اور جسے بد قسمتی سے ہمارے فقہا نے قرآن کے باوجود جیسا اس آیت سے ہویدا ہے۔ اپنا شعار مذہبی بنا لیا ہے۔

"قل لا اجد فی ما اوحی الی محرما علی طاعم یطعمه الا ان یکون میتة او دما مسفوحا او لحم خنزیر فانه رجس او فسقا اهل لغیر الله به ج فمن اضطر غیر باغ ولا عاد فان ربک غفور رحیم ○
وعلی الذین هادوا حرمنا کل ذی ظفر ج ومن البقر والغنم حرمنا علیهم شحومهما الا ما حملت ظهورهما او الحوایا او ما اختلط بعظم ط ذلک جزینهم ببغیهم وانا لصدقون" (سورہ انعام رکوع ۱۸)

مسلمانوں کو اس آیت کو پڑھکر اپنی گریبان میں منہ ڈالنا چاہئے۔ کہ آج ان پر یہ جملہ صادق آتا ہے (وعلی الذین ہادوا حرمنا کل ذی ظفر ج")

اس کی وجہ وہی قرار دی ہے جو وحشیان جزائر اوقیانوس کی ٹابو (Taboo) کی ہے۔ یعنی اقوام اولین وحشیہ کا یہ خیال تھا کہ ان کے آبا و اجداد مختلف قسم کے جانوروں سے پیدا ہوئے ہیں اور انکی روح مرنے کے بعد انہیں جانوروں کی روح میں حلول ہو جاتی ہے۔ یہ اوہام جسکو یوروپ کی اصطلاح میں "طوطم" (Totem) کہتے ہیں انکو مجبور کرتا تھا کہ وہ ان جانوروں کے گوشت سے پرہیز کریں جو خود ان کے مورث اعلی رہے ہیں۔ مثلاً بھیڑیوں والا قبیلہ بھیڑ کو نہ کھائے یا کتے والا قبیلہ کتے کے گوشت سے

پرہیز کرے۔ چنانچہ تقریباً انہیں خیالات کی وجہ سے ہندو گوشت سے پرہیز کرتے ہیں کہ کہیں انکے آباد اجداد کی روح ان جانوروں میں ہو۔ متوفی مہاراجہ کشمیر نے اپنے زمانے میں یہ حکم جاری کر دیا تھا کہ کشمیر کے اندر کوئی مچھلی کا شکار نہ کرے۔ اس لئے کہ ایک پنڈت کی زبانی مہاراجہ کو معلوم ہوا تھا کہ ان کی والدہ کا جنم مچھلی میں ہوا ہے۔ لیکن جہاں تک میں نے غور کیا۔ سوائے سور کے گوشت کے قرآن نے کہیں حلال و حرام گوشت کی فہرست نہیں بنائی ہے۔ قرآن میں درحقیقت بعض کھانے کی چیزوں کی ممانعت محض حفظان صحت کے خیال سے ہے۔ اور اگر یہ مقصد فوت نہ ہو تو ہمارے معدہ پر ہمارے ایمان کا موقوف ہونا یہودیوں اور ہندوؤں کا خیال ہو تو ہو۔ اسلام قرآن کا خیال ہرگز نہیں۔ لفظ میتہ (مردار) میرے خیال میں ان تمام چیزوں پر حاوی ہے جو سڑ گئے ہوں۔ یا بدبودار ہو گئے ہوں یا کیڑے پڑ گئے ہوں۔ اور اگر قرآن نے اس کی تخصیص ممانعت ماکولات میں نہیں کی ہے تو اس کی غالباً یہی وجہ ہے کہ ان سے کراہت کرنا خود انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ ظاہر ہے کہ فطرتاً کوئی انسان بول و براز کے استعمال پر مائل نہ ہوگا۔ اس لئے اس کی ممانعت ایک فضول امر ہوتا۔ اسی طرح بعض طبیعتیں سانپ۔ بچھو۔ کتے۔ بلی کا گوشت دیکھ کر فطرتاً نفرت کرتی ہیں۔ لیکن اگر بعض بلند طبیعتیں اس کے استعمال کر سکتی ہیں تو فبہا۔ انکی ایمانداری) اور اسلام ان کے کھانے پر موقوف نہیں۔ البتہ قرآن نے سور کے گوشت کے ممانعت کی تخصیص کیوں کی۔ یہ ضرور ہے کہ قرآن نے ماکولات ممنوعات کے لئے یہ شرط بھی کر دی ہے کہ اگر اس کے بغیر کھائے کوئی چارہ نہ ہو تو کھایا جا سکتا ہے۔ مگر پھر حرام قطعی کرنے کے کیا معنے۔ گویا اگر مسلمان اسکو بلا عذر کھائے تو وہ احکام قرآنی سے صریحی انحراف کر رہا ہے اور نجات کو خطرہ میں ڈال رہا ہے۔

حالانکہ ہم قرآن کے احکام اخلاقی اور شرعی کے اوامر و مناہی میں کچھ نہ کچھ فوائد اور علت ضرور پاتے ہیں۔ میرا اپنا خیال ہے (ممکن ہے کہ غلط ہو) کہ سامی اقوام سوروں کی ریوڑوں کو پلیدی اور ناپاکی کا منبع سمجھتے تھے۔ چنانچہ انجیل میں ایک واقعہ کا ذکر ہے کہ جب مسیح نے پلید ارواح کو نکالا تو انہوں نے استدعا کی کہ انکو سوروں کے ریوڑوں میں رہنے کے لئے بھیجدیا جائے۔ اور ایسا دیکھا بھی گیا ہے کہ جہاں سور کے ریوڑ رکھے جاتے ہیں وہ جگہ نہایت غلیظ و گندی ہوتی ہے۔ گویا سور ہی ایک ایسا جانور ہے، جو بول و براز اور گندگی میں پرورش پاتا ہے۔ اور اگر عرب لوگ آبادیوں میں پالنے کے لئے ان کو رکھتے تو یقیناً ایسے زمانہ میں جب کہ عرب کو حفظان صحت کی تدابیر پوری طرح معلوم نہ تھیں۔ وہ بہت قسم کی وبا امراض اور ہلاکت کا سبب ہوتیں۔ پس اگر انکے کھانے کی اجازت نہ دی جائے گی تو کوئی انکو پالنے پر بھی آمادہ نہوگا اور اس طرح ایک لازمی آفت سے شہر و دیہات کو بچانا مقصود تھا۔ اور اگر یہ وجہ نہیں ہے تو غالباً اقوام سامیہ جس میں۔ یہود۔ عرب و اہل بابل۔ جبش۔ مصر شامل تھے، ان کا یہ قدیم مسلک تھا جس کی کوئی خاص وجہ نہ تھی یا وہی ہو جیسا ہندوؤں میں گائے کے گوشت کی ہے۔ اور قرآن نے عربوں کی اس قومی عادت کی تائید کر دی اس لئے کہ اسلام کو یہود کے آگے بھی پیش کرنا تھا۔ اور اگر عربوں کو ایسی باتوں سے منع نہ کر دیا جاتا۔

۵ے دیکھو اسلامک ریویو ماہ اکتوبر ۱۹۲۶ء دوکنگ مضمون ڈاکٹر محمد جعفر۔ جس میں فاضل ڈاکٹر نے میرے خیال کی تائید کی ہے۔

تو سود بغض قومی کے وجہ سے ان پر ناپاک ہونے کا طعنہ بھی دیتے اور اسلام کی طرف مشکل سے مائل ہوتے۔ ایسی صورت میں فمن اضطر غیر باغ ولا عاد کے معنی کو اور وسیع کرنا پڑے گا اور سامی قوموں کے علاوہ دوسری اقوام میں اس کے کھانے اور نہ کھانے پر چنداں زور نہ دیا جائیگا لیکن اب تو ہماری ذہنیت کا یہ حال ہے کہ جب میں عراق میں ترجمان جیوش تھا اور میرا کھانا سارجنٹ کے مس (Mess) میں ہوتا تھا میں نے کبھی سور کا گوشت چھوا تک نہیں البتہ میز پر ضرور آتا تھا۔ اور انگریز اس کو کھاتے تھے، مگر اتنے قصور پر تمام پنجابی مسلمان سپاہیوں نے میرا بائیکاٹ کر دیا تھا۔ حالانکہ پنجابی اصحاب میں زیادہ تر وہ لوگ تھے جو خوب شرابیں پیتے تھے۔ اور بعض اوقات ایسے ناگفتہ حرکات کرتے تھے، جو ذکر نہیں کئے جا سکتے۔ اس سلسلہ میں ایک بات ذبیحہ کے متعلق رہی جاتی ہے اور جس کے متعلق عام طور سے مسلمانوں کا خیال ہے کہ جانور جو ایک خاص طریقہ سے ذبح نہ کئے جائیں، اور ذبح کرتے وقت بسم اللہ اللہ اکبر نہ پڑھا جائے تو ایسے جانور کا پیٹ میں اترنا اور ایمان کا سلب ہونا لازم و ملزوم ہے۔ مگر یہ ساری غلط فہمی اس بات سے پیدا ہوئی کہ قرآن شریف میں مسلمانوں کو بتوں کی قربانی کے گوشت کی ممانعت ہے یعنی ایسے تمام جانوروں کے گوشت سے جو خدا کے نام پر ذبح نہ کئے جائیں، اس کے یہ معنی نہیں کہ مسلمان نے جہاں بغیر ذبح کئے ہوئے گوشت کو کھایا اور اسکا ایمان بگڑا، ورنہ ظاہر ہے کہ اہل کتاب کا کھانا ہر طرح حلال ہے اور اہل کتاب کے ذبح کا طریقہ ہمارا سا نہیں اور نہ وہ خدا کا نام لیتے ہیں اور اس لئے بھی کہ اگر کتا شکار کو پکڑ کر مار ڈالے تو اس کے کھانے میں بھی کوئی حرج نہیں۔ مگر اس قول پر ایک اعتراض یہ ہو سکتا ہے کہ قرآن نے جب یہ کہا کہ تم مسلمانوں کو اہل کتاب کا کھانا حلال ہے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ جو مسلمان یا اہل کتاب نہ ہوں ان کا کھانا مسلمانوں کے لئے مباح نہیں اور اسمیں ہندوؤں کے چھوت چھات کی بو آتی ہے۔ اور ہمارا قول یہ ہے کہ احکام قرآنی کا مقصد محض خود اپنے اور اپنے تمام ابنائے جنس کی حفاظت نفس ہے۔ اور یہ ایک لایعنی سی بات ہے کہ ہم دوزخ میں اس لئے ڈالے جائیں کہ ہم ایک خاص طریقہ سے کھانا نہ کھائیں۔ یا ایک شخص کے ہاتھ سے یا اس گھر سے جو مسلمان یا اہل کتاب نہو، میرا اپنا قیاس یہ ہے (اور خدا کیلئے میرے قیاس کو قیاس ہی سمجھو اور اگر اس سے بہتر بات تم جانتے ہو اور اسکی تائید میں قرآن ہو تو میرے قیاس کو رد کر دو) کہ طعام سے مراد ہر قسم کی مواصلت و سوسائٹی ہے۔ مشرکین کے ساتھ اس زمانہ میں جب کہ انکے اور مسلمانوں کے درمیان حالت جنگ قایم تھی۔ اسکی ممانعت ہوگی۔ مگر اہل کتاب کے ساتھ حالت جنگ قایم نہ رہی ہوگی، اس لئے ان کے ساتھ مواکلت و مشاربت پھر بحال خود کر دی گئی۔ اور مشرکین سے حالت جنگ ختم ہونے کے بعد کسی امر کی ضرورت اس لئے باقی نہ رہی کہ کوئی مشرک باقی نہ رہگیا تھا۔ خلاصہ یہ ہے کہ ذبیحہ مثل دوسرے احکام معاشرت کے مذہب سے علیحدہ شے ہے۔ اور اگر ایسا نہیں ہے تو ہکو درحقیقت ہندوؤں کی ظاہر پرستی اور چھوت چھات پر اعتراض کا کوئی حق ہو ہی نہیں سکتا۔

قربانی

قربانی کا مقصد جیسا میں نے اس کتاب کے پہلے باب میں دکھلایا ہے اور جیسا ڈاکٹر ٹائلر (Dr. Tylor) کا خیال ہے سوائے اس کے کچھ نہ تھا کہ اقوام وحشیہ نے موت و بیماریوں کا سبب ایک قسم کا خونخوار دیوتا خیال کیا تھا اور ان کی پرستش کے ساتھ ان کو خوش کرنے یا ان کی بھوک کو رفع کرنے کیلئے اپنی جان کا بدل جانوروں کے ذبح کرنے اور ان کی نذر گزراننے کا (تاکہ انکی خونخواریت بھوک سے مجبور ہو کر خود انکی جان نہ لے) عام طریقہ اختیار کیا۔ یہ تو اس قربانی کا اصل

شار تھا جس کا مترادف انگریزی میں سیکریفائس (Sacrifice) اور ہندوؤں میں بھینٹ اور پرشاد ہے، مگر خود قربانی لفظ اقوام سامیہ کی ایک ایسی اصطلاح ہے جس کے معنی سے یہ خیال پیدا نہیں ہوتا، قربانی کے معنے نزدیکی کے ہیں۔ اور یہی معنے عربی زبان میں بھی ہیں۔ چنانچہ قرآن میں آیا ہے "واتل علیھم نبا ابنی آدم اذ قربا قربانا فتقبل من احدھما ولم یتقبل من الآخر" (المائدہ رکوع ۵) اسی واسطے رابرٹسن اسمتھ (Robertson Smith) مصنف "مذاہب سامیہ" کا خیال ہے کہ قربانی کی رسم کا مدعا در اصل یہ تھا کہ دیوتاؤں اور پجاریوں کے درمیان ایک سفرۂ ضیافت بچھایا جائے اور اس ذریعہ سے دونوں میں ایک قسم کی قربت و موانست یا یگانگت پیدا کی جائے۔ ڈاکٹر فریزر (Dr. Frazer) کا خیال ہے کہ دیوتاؤں کی زندگی کو تازہ کرنے اور ان کو بوڑھا نہ ہونے دینے کے لئے ہر سال جانوروں کو مار کر اس کے خون و روح سے انکی زندگی کو تازگی و تقویت پہونچائی جائے۔ جیسا پرانے زمانے کے بعض سلاطین مشرقیہ اپنی زندگی کے بڑھانے کے لئے دوسرے انسانوں کی جان لینے میں دریغ نہ کرتے تھے۔ ماریلیر (Marillier) فرانسیسی کا قول ہے کہ قربانی کا خیال سحر کے خیال پر مبنی ہے کہ ابتدائی قوموں کا خیال تھا کہ خون کے گرنے سے سحر کا اثر جو انسان اپنے اوپر وہم کرتا ہے جاتا رہے۔

جن لوگوں نے یہود، ہنود و پارسیوں کے کتب مذہبی کا مطالعہ کیا ہے وہ غالباً اس بات کو حیرت سے دیکھیں گے کہ یہ مذاہب جو الہامی ہونے کے مدعی ہیں رسم قربانی میں عام وحشیوں کے ہم نوا ہیں۔ گویا قربانی کا ان مذاہب میں ایک رسم مذہبی اور عبادت قرار پانا صرف اس بات کا پتہ دیتا ہے کہ وہ مذاہب بھی اپنے اندر بہت سے ایام وحشت و جہالت کی یادگار رکھتے ہیں۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ اگر ہم کسی مذہب کے الہامی اور غیر الہامی ہونے کا کوئی معیار مقرر کر سکتے ہیں تو ہمارے لئے اسقدر کافی ہے کہ یہ جانچ کر لیں کہ اس مذہب میں قربانی کرنا ایک مذہبی فریضہ ہے یا نہیں۔ اور اگر کسی مذہب میں قربانی مناسک مذہب میں سے قرار پائی ہے تو ہم یقیناً یہی نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ وہ مذہب خداشناسی سے قاصر ہے اور اس نے انسانی ہراس موت کی تسکین کے لئے قربانی کا طریقہ ایجاد کیا۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ یہ فعل اسی خیال پر مبنی ہوگا کہ دیوتاؤں کی خونخواری کے لئے تازہ خون بہم پہونچایا جائے ورنہ اگر ان کو بھوک نے ستایا تو وہ ہماری جان کو لیکر رہیں گے۔ اور یہ اعتقاد ہرگز الہامی اعتقاد نہیں ہو سکتا۔

عرب میں اسلام کی تجدید سے قبل تمام دنیا کا یہی مسلک رہا ہے۔ اور اگر قربانی کا طریقہ الہامی مذاہب میں پایا جاتا ہے تو اسکی صرف دو ہی توجیہ ہو سکتی ہیں، یا تو یہ طریقہ بعد کو اوہامی خیالات کے فروغ سے الحاق ہو گیا یا پھر قربانی کا مقصد یہ تھا کہ انسان اس خالق و رزاق کے سامنے چند ہدایا گزران کر اپنی عبدیت اور ممنونیت کا اظہار کرے۔ غالباً اسی وجہ سے مسلمانوں میں قربانی کا گوشت فقراء و مساکین میں تقسیم کر دیا جاتا ہے جو ایک قسم کی خیرات ہے اور یہودیوں کی طرح وہ قربان گاہ پر جلا کر چڑھاوا پیدا نہیں کرتے۔ شاید اسی قسم کی نذر و ہدیہ کا حوالہ قرآن کی اس آیت میں ہے جو میں نے ابھی نقل کی ہے۔

مگر اس تاویل میں دقت یہ آپڑتی ہے کہ جانور کا ذبح کیا جانا کیوں شرط قربانی ہے حالانکہ اگر بلا ضرورت جانور کو ذبح کیا جائے تو یہ ایک قسم کی سنگدلی اور شقاوت ہے اور اس سے خونخوار دیوتا خوش ہو تو ہو۔ خدائے اسلام کو کوئی دلی حظ یا مسرت نہیں حاصل ہو سکتی۔ خود

قرآن شریف میں ہے۔ "لن ینال اللہ لحومھا ولا دماؤھا ولکن ینالہ التقویٰ"۔ اور یہ کہ کسی جانور کو بلاوجہ ایک وہم پر ذبح کر دیا جائے ایک عبث و برا فعل ہے وہ اس مشہور حدیث سے ثابت ہے۔ کہ آنحضرت کے زمانے میں کسی عورت کے پاس ایک اونٹ تھا، اس اونٹ نے اسکو ایک خطرہ سے اور جنگ میں گھر جانے کے وقت بچا لیا تھا اس شکر گذاری میں اس عورت نے چاہا کہ وہ اس اونٹ کو کعبہ میں قربانی دے۔ آنحضرت نے جب اس کے اس ارادہ کو سنا تو فرمایا۔ سبحان اللہ اونٹ کی خدمت کی جزا کیا اچھی دی گئی اور آپ نے فوراً اس اونٹ کو اس سے لے لیا۔ اسلئے اگر یہودیوں کا مذہب الہامی سمجھا جائے تو اسکی تاویل یہی ہو سکتی ہے کہ یہودیوں نے امتداد زمانہ اور مشرکین کنعان کی صحبت بد سے یہ رسم اختیار کر لی۔ اور یہ ثابت ہے کہ یہودیوں نے حضرت موسیٰ اور ابنیا کے زمانہ میں بت پرستی اختیار کر لی تھی۔ کم سے کم انکا بعل دیوتا کو پوجنا ایک تاریخی واقعہ ہے۔ باقی رہا اسلام۔ اس کے متعلق میں آزادی سے محاکمہ کر سکتا ہوں۔ سب سے پہلے ہمکو یہ دیکھنا ہے کہ عید الضحیٰ یا ایام حج میں خصوصاً منا کے روز جو جانور ذبح کئے جاتے ہیں وہ کس اعتقاد پر مبنی ہیں۔ ہمارے علما تو جھٹ یہ فرما دیں گے کہ جناب یہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ کی سنت دیرینہ ہے، جب وہ حضرت اسمٰعیلؑ کی قربانی دینے چلے تھے تو خدا نے انکے ایمان کی آزمائش میں انکو پورا پاکر بہشت سے ایک موٹا تازہ دنبہ بھجوا دیا، اور حضرت ابراہیم نے اس کو پکڑ کر اپنے بیٹے کی جگہ اسکی قربانی کر دی۔ حضرت ابراہیم کا اپنے بیٹے کی قربانی کرنا یا اسکی جگہ کسی دنبہ کی قربانی کرنا، کوئی خلاف واقعہ بات نہیں۔ حضرت ابراہیم خود عرصے تک اور انکے آبا و اجداد بابل کے قدیم مذہب کے پابند تھے جس میں قربانی کی رسم تھی، حضرت ابراہیم نے جب اپنے آبائی مذہب اور وطن کو ترک کیا اور نبوت ورسالت کو پہونچے تو شیطان نے انکو پرانی مذہبی رسم یاد دلا کر دھوکا دیا کہ یہ رسم تمکو اب بھی کرنا چاہیے۔ وہ اس دھوکے میں پڑے تھے کہ خدا کے فرشتے نے انکو وقت پر آگاہ کر دیا چونکہ حضرت ابراہیم ایک بہت بڑی غلطی سے بچائے گئے تھے۔ ممکن ہے انہوں نے اسکی یادگار میں ایک دنبہ اسوقت ذبح کر دیا ہو۔ یا ہر سال ایک دنبہ ذبح کر دیا کرتے تھے۔ جو اس یاد کو تازہ کرنے کے ساتھ انکی خوراک کے کام آتا تھا۔ اور یہ یادگار مکہ میں قایم رہ گئی شاید و فدیناہ بذبح عظیم میں اسکا حوالہ ہو۔ اب رہا ارکان حج میں سے قربانی کا ضروری ہونا تو ارکان واجبات حج کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

ارکان:۔ احرام۔ طواف۔ سعی۔ وقوف عرفات

واجبات:۔ رمی جمار۔ قیام مزدلفہ۔ قیام منا۔ طواف وداع

فقہا نے واجبات کے ترک پر قربانی کا کرنے کا حکم دیا ہے۔ مگر یہ واجبات بذات خود اختیاری ہیں اور ان کے کفارہ میں قربانی کا حکم فقہا کا محض قیاس ہے۔

مناہیات حج۔ مردوں کو سلا ہوا کپڑا پہننا۔ عورتوں کو منہ ڈھانکنا۔ خوشبوؤں کا استعمال کرنا۔ عورتوں سے ہم بستر ہونا یا مقدمات جماع میں کوئی بات کرنا۔ شکار کرنا۔ انمیں سے کسی کام کے خلاف کرنے پر فقہا نے قربانی کا حکم دیا ہے۔ مگر یہ بھی محض انکا قیاس ہے۔ قرآن تو علیحدہ رہا حدیث بھی اس سے خاموش ہے۔ فقہا نے ان صورتوں کے علاوہ اور بہت سی صورتوں میں محرم کو قربانی کی ہدایت کی ہے مگر ہمکو کوئی ایسی مرقوم اور متصل الاسناد حدیث نہیں ملی جس سے ثابت ہو کہ فقہا کی تجویز کی ہوئی صورتوں میں قربانی کرنا ضروری ہے۔ ممکن ہے کہ فقہا نے صور مذکورہ کو قتل صید وغیرہ پر قیاس کر کے ان میں بھی فدیہ تجویز کیا ہو ورنہ کوئی نص صریح و صحیح تو ان پر قایم ہی نہیں۔

قرآن مجید میں صرف چار صورتوں میں فدیہ دینے کا حکم ہے۔ تین صورتیں تو آیہ **واتموا الحج والعمرۃ للہ** میں مذکور ہیں جو عنوان حج کی پہلی آیت ہے اور ایک ساتویں پارے کے دوسرے رکوع میں یعنی قتل صید میں۔ واجبات کی تاکید اگر آنحضرت نے کی ہے اور مناہیات سے منع کرنے کا اگر کہیں حکم ہے تو قربانی کے ذریعہ سے فدیہ دینے کا حکم کم سے کم میری نظر سے نہیں گذرا بلکہ اگر اس حدیث[1] کو صحیح مانا جائے تو اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص حالت احرام میں خوشبو سے لتھڑا ہوا کپڑا پہن لے تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ کپڑے کو تین دفعہ دھوڈالے، اور اسی پر اور صور ممنوعہ کو قیاس کر لینا چاہئے۔ الغرض ہم حدیث سے بھی کہیں اس بات کا پتہ نہیں چلتا کہ آنحضرت نے ان صورتوں میں فدیہ کا حکم فرمایا ہو، اور جب یہ ہے تو ہم انہیں خون پر اکتفا کر لینا چاہئے جو قرآن و حدیث میں آئے ہیں۔ پھر جو لوگ یوم النحر میں کثرت سے قربانیاں کرتے ہیں یہاں تک کہ ایک شخص سو سو دو دو سو جانور ذبح کر ڈالتا ہے وہ محض بے سود اور نہ محض بے سود بلکہ اسراف میں داخل ہے۔ سنا جاتا ہے کہ یوم النحر کو منا میں اسقدر قربانیاں ہوتی ہیں کہ گوشت کثرت کی وجہ سے کھتوں میں دبا دیا جاتا ہے اور اسکا کوئی کھانے والا نہیں ملتا۔ خیریت یہ ہے کہ عرب کی آب و ہوا خشک ہے ورنہ مکہ اور اسکے جوار میں ایسی ہولناک بیماریاں پھیل جاتیں کہ مذہب اسلام کی قوام پر ایک لعنت ظاہر کرنے کے لئے دشمنان دین کو اچھا موقع ہاتھ لگ جاتا۔

قرآن میں ایک جگہ ہے **فصل لربک وانحر** اور النحر کے معنے قربانی کرنے کے عام طور سے سمجھے جاتے ہیں مگر میرا خیال ہے کہ یہاں پر النحر کے معنی وہ نہیں ہیں جو عام طور سے سمجھے جاتے ہیں۔ اور نہ سیاق عبارت سے یہاں پر اسکی مراد لی جا سکتی ہے۔ النحر کے عربی میں کئی معنے ہوتے ہیں اور ایک معنی دل کی توجہ کے ہیں جو یہاں پر زیادہ موزوں معلوم دیتا ہے۔

غرضکہ جہاں تک میں نے غور کیا ایام حج کو جانور ذبح کئے جانے کا کوئی مذہبی فریضہ اسلام میں معلوم نہیں ہوتا۔ البتہ اس کے عربی قومی رسم ہونے میں کوئی کلام نہیں اور اگر یہ عبادت اسلام عرب میں باقی رکھی گئی ہے یا رکھی جائے تو اسکا مقصد جاہلیت میں خواہ کچھ ہو اب صرف اسی قدر ہو سکتا ہے کہ ان ایام عید و جشن و اجتماع میں ضیافتیں و دعوتیں ہوں۔ اور لوگ سیر ہوکر کھائیں اور اس کے لئے جانور ذبح کئے جائیں۔ خصوصاً ایسے زمانہ میں جبکہ ایام حج میں دس دس روز تک ہر قسم کے شکار کی ممانعت کر دی جاتی ہے۔ لیکن یہ کسقدر شرم اور افسوس کی بات ہے کہ باوجودیکہ قرآن ہی دنیا کی ایک ایسی مذہبی کتاب ہے جس نے سب سے پہلے اس تصریح کو ضروری سمجھا ہے کہ جانور کا خون و گوشت خدا کو نہیں پہونچتا جیسا کفار جاہلیہ و وحشیہ کا خیال تھا۔ اب تو مسلمان قربانی کو تقریباً اسی اعتقاد پر کرتے ہیں جو ایک ہندو کالی مائی پر بکرے کے بھینٹ سے کرتا ہے۔ اور ہر مسلمان جو قربانی کرتا ہے اسکو یہ بتایا جاتا ہے کہ قیامت کے روز وہ تمام جانور اسکی سواریوں کے کام آویں گے اور فقہا نے تو یہودیوں کی طرح نقل کی ہے کہ اگر جانور عیب دار ہو یا اس کے کان کٹے ہوں یا کوئی سا پنج عیب شرعی

---

[1] عن یعلی بن امیہ قال کنا عند النبی صلی اللہ علیہ وسلم بالعمرۃ اذا جاءہ رجل اعرابی علیہ جبۃ وھو منضمخ بالخلوق۔ فقال یا رسول اللہ انی احرمت بالعمرۃ وھذا علی۔ فقال۔ اما الطیب الذی بک فاغسلہ ثلث مرات واما الجبۃ فانزعھا ثم اصنع فی عمرتک کما تصنع فی حجک (صحیحین)

اس میں ہو تو اللہ میاں کو ایسا بکرا پسند نہ آئے گا اور اس کی قربانی بے سود ہوگی (ونعوذ باللہ من تلبیس الابالیس والفوات العوام)
اگر جانوروں کو بلاضرورت ذبح کرنے کا یہی مقصد ہے کہ اس سے خدا خوش ہوتا ہے تو ایسے مذہب کو اور ایسے خدا کو دور سے سلام ہے۔
خدا کی شان نظر آتی ہے کہ جن مذاہب میں ان خیالات کی بنا پر قربانی ایک فریضۂ مذہبی ہے مثلاً یہود، ہنود و مجوس انہوں نے تو اگر اس دور تمدن میں اس مذموم حرکت کو ترک کر دیا ہے اور مسلمان جن کے قرآن نے اس رسم کے خلاف سب سے پہلی آواز اٹھائی تھی وہ جنون و جہالت مذہبی اور قدیم یہودیت پرست کے احکام سے متاثر ہو کر اس کو ایک فریضہ جانکر اسلام کو بدنام کر رہے ہیں اور مذہب اسلام کو ایک خونی مذہب دکھلا رہے ہیں۔ اور ہندوستان میں تو وہ بکروں اور گایوں کے ساتھ اکثر اوقات اپنی ہمسایہ قوموں کے ہاتھوں سے خود بھی قربان ہو گئے ہیں۔ اور یہ کتنی بڑی لطف کی بات ہے کہ مسلمان کا گھر سال بھر میں ایک بار بوچڑ خانہ میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ یہی خیریت ہے کہ مسلمان ابھی انہیں ممالک میں پھیلے ہیں جہاں تمدن ادنیٰ درجہ پر ہے۔ اور جہاں کی میونسپلٹیوں کو اپنے اپنے احکام حفظان صحت کو پورے رواج دینے کا خیال نہیں آیا۔ لیکن اکثر اوقات میں سوچتا ہوں کہ اگر ہمارے مولوی یورپ یا امریکہ کے کسی ملک میں بھیجدئے جائیں تو بیچارے اس فریضۂ مذہبی کو اپنے گھر کے اندر کیسے بجا لائیں گے۔ مگر چونکہ اب تقریباً اسلام ایک قسم کا قومی مذہب ہو گیا ہے جو صرف گرم ملکوں کے غیر ترقی یافتہ قوموں کے اندر محدود ہے۔ یوروپ و امریکہ کا اندیشہ لایعنی سی بات ہے میں نے یہ جملہ اس لئے کہدیا تھا کہ میرے سامنے قرآن کا اسلام وہی جو تمام دنیا میں پھیلایا جا سکتا ہے۔ اور جو ہمارے موجودہ اسلام سے بیّن فرق رکھتا ہے۔

بخور جلانا یا ہون کرنا

عبادت مذہبی کی دوسری صورت یعنی بخور و خوشبوئیں جلانا گویا قربانی کی ایک ارتقائی صورت ہے پہلی صورت کا مقصد یہ تھا کہ دیوتاؤں کی بھوک کی غضبناکی انکو خوراک دیکر دور کی جائے اور بخور جلانے کا یہ مقصد یہ ہے کہ دیوتاؤں کا غصہ و قہر خوشبوؤں کے پھیلانے سے ٹھنڈا کیا جائے۔ بائبل کے عہد نامۂ قدیم کے صفحات اس بات کا پورا پتہ دے رہے ہیں کہ ابتدائی عقول انسانی کیونکر رفتہ رفتہ جانوروں کی قربانی سے ترقی کرتے کرتے بخور جلانے والی عبادت پر پہونچے ہیں۔ کیونکہ بخور جلانے کا ذکر شریعت موسوی کے قبل کہیں نہیں ہے لیکن مصر کے آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ مصریوں میں یہ معمولات بہت زمانہ دراز سے گئے ہیں مصر میں جس قدر پرانے معابد کے آثار باقی رہ گئے ہیں ان کے نقش و نگار سے ظاہر ہوتا ہے کہ ملوک و فراعنۂ مصر اپنے دیوتاؤں کے آگے بخور جلانے والے برتن لئے ہوئے کھڑے ہیں۔ ان کے ایک ہاتھ میں بخور جلانے والا برتن ہے اور دوسرے ہاتھ سے وہ بخور لے کر اس میں جلانے کے لئے ڈال رہے ہیں۔ بعض اوقات ایک ہاتھ میں بخور جلانے کا برتن ہوتا ہے، اور دوسرے ہاتھ میں کوئی سرکہ یا کسی قسم کی شراب یا شربت وغیرہ دیوتاؤں کے نذر کرنے کے لئے زمین پر ڈال رہے ہیں۔ سب سے صاف نقش و نگار اس قسم کی عبادات کا اہرام مصری جیزہ میں ہیں جس میں فرعون تماسس ( ) آفتاب کے دیوتا "را" (Ra) کے سامنے ایک ہاتھ سے شراب کی نذر دے رہا ہے اور دوسرے ہاتھ سے بخور جلانے کا برتن لئے دھونیاں دے رہا ہے مصریوں (بلکہ عموماً تمام غیر آریہ

قوموں) کا عام دستور یہ تھا کہ وہ اپنے دیوتاؤں کی تین وقت پرستش کیا کرتے تھے۔ صبح، عصر و شام۔ صبح کے وقت وہ بخور کے لئے لوبان استعمال کیا کرتے تھے۔ عصر کے وقت مُر اور شام کے وقت ایک قسم کا مخلوط مسالہ۔ پلوٹارک (Plutarch) نے لکھا ہے کہ بخورات میں علاوہ اس تاثیر کے جو دیوتاؤں کی غضبناکی کے فرو کرنے کا کام دیتا تھا۔ اس سے ایک دوسرا فائدہ یہ بھی ہوتا تھا کہ انکی خوشبوؤں سے پجاریوں پر ایک خاص قسم کا اعصابی اثر پڑتا تھا۔

یہودیوں کی کتاب مقدس میں بخورات کے لئے لفظ کتورہ استعمال کیا گیا ہے جو فعل "کتر" سے بنا ہے اور جس کے معنی یہ ہیں کہ ایسی خوشبوئیں جو تسلی دینے والی ہوں اور اس میں قربانی کے گوشت کی چرائند سے لیکر ہر قسم کی ادویات جس کے جلانے سے خوشبودار دھواں پیدا ہو سب شامل تھے۔ ارمیاہ اور یشعیاہ کے نوشتوں سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے زمانے میں بخورات کے لئے لوبان جلانے کا عام دستور تھا، قربان گاہ پر یہودیوں کے احبار صبح کے وقت جبکہ عبادت گاہ کے چراغ میں بتّی الکسائی جاتی تھی اور ہر شام کے وقت جبکہ عبادت گاہ کے چراغ روشن کئے جاتے تھے اور سال میں ایک بار ہیکل کے سب سے زیادہ مقدس مقام پر آگ کے ان شعلوں سے جو قربان گاہ سے لئے جاتے تھے یہ خوشبوئیں جلائی جاتی تھیں۔ اور ہر سبت کو بخور اور قربانی کا گوشت اور فطیری روٹی قربان گاہ پر چڑھائی جاتی تھی۔ اس بخور جلانے کا جو مقصد ہوتا تھا اسکی پوری توجیہہ کتاب استثنا کے باب ۱۶ کے ۱۲ اور ۱۷ آیتوں میں مسطور ہے۔ توریت سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ مُردوں کے پاس اور اکثر اوقات گھروں میں بھی اسکا استعمال کیا جاتا تھا۔

نینوا (Nineveh) کی عمارتوں کے نقوش و نگار سے پتہ چلتا ہے کہ اہل اسور و کلدان بھی اپنی دیوی اور دیوتاؤں کے سامنے بخور جلایا کرتے تھے۔ شاہان اسور اور مذہب کے پروہتوں کو بخور جلانے اور شجر زندگی پر شراب ڈالنے کی تمثالیں اکثر عمارتوں پر بنی گئی ہیں۔ بقول ہیروڈوٹس تقریباً ایک ہزار مروجہ کی خوشبوئیں بعل دیوتا کے میلے میں بابل کی سب سے بڑی قربانگاہ پر جلائی جاتی تھیں۔

پرسیپولس (Persepolis) یا اصطخر قدیم پایہ تخت فارس کے آثار اور شاہان ساسان کے قدیم سکوں سے پتہ چلتا ہے کہ خوشبو کا جلانا ایران قدیم کی بھی ویسی ہی ایک مذہبی عبادت تھی۔ جیسا کہ مصر و بابل اور یہودوں میں تھی۔ سامی قوموں میں عبادت کے معینہ تین تھے یعنی صبح۔ عصر و شام۔ مگر مجوسیوں میں اوقات عبادات پانچ ہوتے تھے دو زائد وقت دوپہر اور مغرب کے۔ ان پانچ اوقات میں موبدان مجوس خوشبوؤں کو اپنی مقدس آگ کی قربانگاہ پر جلاتے تھے۔ اوستا میں خوشبوئیں جو عبادات میں مستعمل ہوتی تھیں، انکا نام "رد ہوگا دونگھا" ہے۔ ہیروڈوٹس کا بیان ہے کہ دارا کے وقت میں عربوں سے تقریباً ہزاروں مروجہ کے قریب خوشبوئیات کا خراج لیا جاتا تھا اب بھی ہندوستان کے پارسیوں میں یہ قدیم مذہبی رسم اس طرح جاری ہے جیسا پرانے زمانوں میں تھی۔

رامائن اور مہابھارت میں ہندوؤں کا زمانہ قدیم سے اپنے دیوتاؤں کے آگے خوشبوئیں جلانے کے دستور کا پتہ چلتا ہے بدھ کے زمانہ میں بھی ہندوؤں میں خوشبو جلانے کا عام دستور تھا، اور اب بھی جہاں جہاں بدھ مذہب پایا جاتا ہے وہاں خوشبو جلانے کی عام رسم مذہبی پائی جاتی ہے۔ موجودہ ہندو مذاہب میں ہون کرنا خاص فریضہ مذہبی ہے۔ ہون میں اور خوشبوؤں کے علاوہ گھی کا جلانا بھی ضروری سمجھا جاتا ہے۔

قدیم یونانیوں میں ہومر کے بعض جملوں سے لوگوں کو شک ہوگیا ہے کہ آیا بخور کا جلانا قدیم یونانیوں کا مذہبی فریضہ تھا یا نہیں۔ اور آیا کہ وہ لوگ قربانی کے ساتھ اسکا استعمال کرتے تھے۔ لیکن عود کا گھروں میں جلانا تو یقینی طور سے کہا جاسکتا ہے۔ مگر چونکہ یہ خوشبو ہندوستان میں پیدا نہیں ہوتی تھیں اور ان کی تجارت یونان میں آٹھ صدی قبل مسیح تک وسیع نہیں ہوئی تھی۔ اسواسطے قیاس یہ ہے کہ یونانی بھی اپنے دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لئے کسی نہ کسی قسم کی خوشبو کرتے تھے۔ گو کہ وہ بخور نہ ہوتے تھے۔ چنانچہ مناجاتیں جو "ارنگ" کے نام سے موسوم ہیں اس میں اس بات کی پوری صراحت ہے کہ کون کون سے دیوتا کن کن خوشبوؤں سے محظوظ ہوتے تھے۔ ان ادویات میں بعض ایسی چیزیں بھی ہیں جو بلحاظ خوشبو کے کوئی خاص وقعت نہ رکھتی تھیں مگر شاید ان میں کوئی اور خاص خصوصیت پائی جاتی ہوگی۔

قدیم رومیوں میں بخور کا جلانا مذہبی فریضہ کے طور پر اس سے بہت قبل رائج تھا جبکہ ہندوستان کے خوشبودار مصالحوں سے وہ لوگ واقف ہوئے تھے اور اس کے بعد تو بخور ایک مخصوص شغل مذہبی ہوگیا تھا۔ اور نہ صرف عبادتگاہوں میں استعمال کیا جاتا تھا بلکہ بعض ایسی تقریبات میں جبکہ ایک فاتح فتحمندانہ طریقے سے شہر میں داخل ہوتا تھا۔ خانگی زندگی میں بھی خوشبوؤں کا استعمال اکثر وقتوں پر کیا گیا ہے۔ رومی اپنے خاندانی دیوتا لار فیملیر یائس (Lar familiaris) کے آگے اسکو روزانہ وقت معینہ پر جلایا کرتے تھے اور قربانیوں میں جانوروں کے سر پیر میں یہ خوشبو میں لگا کر ذبح کیے جاتے تھے اور اسکے بعد وہ قربانی کے خون میں ملا کر دیوتاؤں کو چڑھایا جاتا تھا اور اکثر اوقات اس آگ میں بھی ڈالا جاتا تھا جسپر قربانی جلائی جاتی تھی۔

مسیحیوں میں بھی بخور کا استعمال مذہبی فریضہ کے طور سے کیا گیا ہے اور اب بھی بعض کلیسا میں کیا جاتا ہے قبل اس کے عقائد منبقیہ کے لئیں سے قسطنطین نے مسیحیت کو قدیم رومیوں کے مذہب کی صورت میں مسخ کردیا علمائے مسیحیت نے بخور کا استعمال مشرکانہ اور بت پرستانہ رسم قرار دیکر محض خانگی ضرورتوں میں اس کے استعمال کی اجازت دی تھی اور ٹرٹیلین نے اس کا جواز صرف اس واسطے تسلیم کیا تھا کہ یہ چیزیں محض ناپاکی اور بدبو دور کرنے کا ذریعہ ہیں۔ لیکن ابتدائی زمانہ مسیحیت میں حواریان مسیح کی بعض تحریروں سے ثابت ہوتا ہے کہ خوشبوؤں کا استعمال یوکارسٹ کے رسوم میں کیا گیا ہے۔ اور "ادیگیریس" (Origenes) نے اپنی کتاب میں ذکر کیا ہے جو ان مجسم خوشبوؤں کا ایک بڑا ذخیرہ یروشلیم کی ہیکل میں جلانے کے لئے بھیجا کرتے تھے۔ پوپ گرے گوری (Pope Gregory) کے زمانہ سے پہلے اس کا استعمال مذہبی جلوس اور عبادات میں کثرت سے کیا گیا ہے۔ غالباً ابتدائی زمانے میں مسیحیت میں بھی ان مراسم کے ادا کرنے کا وہی منشار تھا جو بت پرست مشرکین اور یہود کی قوموں کا تھا گو کہ بعد کو علمائے مسیحیت نے اسکی توجیہہ یوں کرلی کہ خوشبو کا استعمال محض گندگی اور بدبو کو دور کرنے کے لئے ہوتا تھا۔ چنانچہ ایک مورخ نے شارلمین (Charlemann) کے زمانہ میں خوشبو پر برکات دینے کا یہ منشار لکھا ہے "کہ خدائے قدوس ان خوشبوؤں کو برکت دے تاکہ اس سے بری بدبوئیں دور ہوں اور تاکہ اچھی خوشبوئیں پھیلیں" مگر اولین و متقدین علمائے مسیحیت کا بخور جلانے کی رسم سے انکار اور انکا احتجاج اس بات پر ضرور دلالت کرتا ہے کہ ابتدائی مسیحیت میں قربانی اور

خون کی چرا ہند کے ساتھ بخور کا استعمال انہیں عقائد سے ہوا کرتا تھا جو عام مشرکین اور یہود کا خیال تھا۔
مسلمانوں میں بخور کے متعلق کوئی مذہبی احکام نہیں پایا جاتا۔ اگرچہ صوفیہ میں مزارات اولیا پر بخور جلانے کی رسم ہے۔ مگر مزارات و بخور دونوں باتیں اسلام سے باہر ہیں۔ اور جو لوگ اسکو کرتے ہیں وہ اسکو مذہبی فریضہ نہیں جانتے۔ بلکہ یا تو بد اعتقادی اور بدبختی سے یہ باتیں کرتے ہیں یا اپنے معاش کا ایک ذریعہ جان کر قبروں کو بتکدہ بناتے ہیں۔ اسلام انکے فعل کا ذمہ دار نہیں۔

(باقی آئندہ)

سید مقبول احمد

چھ چندن ہار ایک دم طلب کرنیوالے کو
ساتواں ایک چندن ہار مفت بطور انعام روانہ کیا جائیگا

ایک نئی ایجاد

ہزاروں کا بھرم صرف چند روپوں میں

یہ چندن ہار بالکل اصلی سونے کی مانند چمکدار سنہری ہے۔ اور خوبصورتی میں اپنا جواب خود ہے۔ طلائی زیور کے ہمراہ یا تنہا۔ اپنی قیمت اصلی سونے کی بتا کر محفل میں تعریف کا اعلیٰ رتبہ حاصل کرتا ہے۔ اور اپنے سنہری لباس کو ہمیشہ قائم رکھکر اپنے مالک کی عزت کو دوبالا کرتا ہے۔ نیز گلے میں زینت دیکر صحیح اندازہ پانچسو روپیہ کا بتاتا ہے یہی باعث ہے کہ بہت مقبول ہے۔

کیا آپ اپنی محبوب بیوی یا عزیزہ دختر کیلئے طلب کرکے ان کے ارمان کو پورا کرینگے؟

قیمت۔ قسم اول پانچ روپے (صہ)
قسم دوم تین روپے (سے)

چھیپ واچ ہاؤس اجمیری گیٹ دہلی

قبیلۂ بنی عذرہ کی داستان حسن و عشق

اور

معاویہ کی امارت و سیادت کے مقابلہ میں ایک بدوی جمال کا شاہانہ استغنا

تاریخ عرب میں قبیلۂ بنی عذرہ کو اپنے شرف حسن و جمال اور امتیاز عشق و محبت کی وجہ سے جو خصوصیت حاصل ہے وہ اہل علم سے پوشیدہ نہیں۔ سرزمین نجد کے اس قبیلہ کی کسی لڑکی کا نام لے دینا، اب بھی گویا "جمال بارع" اور "محبت عفیفہ" کے کسی مجسمہ کا ذکر کر دینا ہے، یہاں تک کہ عربی زبان میں "الہوی العذری" (یعنی بنی عذرہ کی سی محبت) ضرب المثل کی صورت اختیار کر چکی ہے۔

ذیل کا واقعہ اسی قبیلہ کے "افسانۂ عشق و حسن" کا ایک ورق ہے جس کا ذکر ابن جوزی، نویری وغیرہ نے کیا ہے اور اس کو راویوں کے سلسلہ سے ہشام بن عروہ تک پہونچایا ہے جو قرن اول کے مشہور محدث تھے۔

نیاز

(۱)

امیر معاویہ میں دیگر امیرانہ خصوصیات کے ساتھ ایک خصوصیت ان کی معیشت و معاشرت کی نفاست و پاکیزگی بھی تھی۔ اسلام کی وہ سادگی جو عہد سعادت یا زمانۂ خلافت اربعہ میں پائی جاتی تھی، اس کا نام معاویہ کی زندگی میں کہیں پتہ نہ تھا نہ ان کے اعمال و افعال میں۔ وہ ایک امیر تھے، رئیس تھے بلکہ ایک خود مختار بادشاہ تھے اور ان کی امارت و سیادت میں ان اکاسرۂ عجم کی سی شان و شوکت پائی جاتی تھی جنکو اسلام نے فتح کیا اور مسلمان خود اس سے مفتوح ہو گئے۔ عرب نے عجم کی زمین پر قبضہ کیا اور عجم نے عرب کے اخلاق پر جس کی سب سے پہلی روشن مثال امیر معاویہ کی ملوکیت تھی۔ وہاں حاجب و دربان بھی تھے، اور نقیب و چاؤش بھی، عجم کی درباریاں بھی تھیں اور انعام و اکرام کی بارشیں بھی، زرین کمر غلام بھی تھے اور نازک کمر کنیزیں بھی۔ وہی ریگزار عرب جس کے عیش و نشاط کی ساری کائنات بقول فردوسی "شیر شتر خوردن و سوسمار" سے زیادہ نہ تھی، وہیں نصف صدی کے اندر اندر، ایک ایک امیر عرب کا گھر فردوس بنا ہوا نظر آتا تھا اور دنیا کی تمام وہ عشرتیں جو دولت و حکومت سے حاصل کی جا سکتی ہیں، اُن کی مملوک تھیں۔ چنانچہ امیر معاویہ کے دسترخوان کی وسعت، مختلف قسم کے لذیذ کھانوں کی اختراع اور کھانے کے وقت نغمہ و موسیقی، لطائف و ظرائف کی صحبتیں تاریخ عرب کے کھلے واقعات ہیں۔[۱]

۱۔ امیر معاویہ کے بہت سے "لطائف مایدہ" تاریخ میں محفوظ ہیں۔ انہیں میں سے ایک یہ بھی نہایت لطیف واقعہ ہے جو جناب حسینؓ کے ساتھ ہوا۔ ایک بار جناب حسینؓ بھی مدعو تھے اور دسترخوان پر مختلف قسم کے کھانے چنے ہوئے تھے۔ جناب حسینؓ نے مرغ مسلم لیکر اسکا گوشت جدا کرنا چاہا۔ امیر معاویہ نے مزاحاً کہا "ہل بینک وبینہا علاوۃ" کیا آپکے اور اس مرغی کے درمیان کچھ عداوت ہے؟ جناب حسین نے برجستہ فرمایا (وہل بینک وبین ابنہا قرابۃ) کیا تمہارے اور اس کے بیٹے کے درمیان کچھ قرابت ہے۔

ایک دن کا واقعہ ہے کہ معاویہ کا دسترخوان پوری وسعت کے ساتھ بچھا ہوا ہے اور ہر شخص کو شرکت کی اجازت ہے۔ ہجوم آہستہ آہستہ ہٹتا جاتا ہے اور کھانا شروع کرنے کی اجازت ہونے ہی والی ہے کہ قبیلۂ بنی عذرہ کا ایک خوشرو نوجوان، جس کے چہرہ سے شرافت غمگینی اور جذبات حزیں ظاہر ہو رہے تھے، اٹھا اور اس نے معاویہ کو مخاطب کرکے کہا۔

معاوی، یاذالفضل والحلم والعقل　　وذالبر والاحسان والجود والبذل

اتیتک لما ضاق فی الارض مسلکی　　وانکرت مما قد اصبت بہ عقلی

ففرج۔ کلاک اللہ۔ عنی فاننی　　لقیت الذی لم یلقہ احد قبلی

وخذ لی۔ ھداک اللہ حقی من الذی　　رمانی بسھم کان اھونہ قتلی

وکنت ارجو عدلہ ان اتیتہ　　فاکثر تردادی مع الحبس والکبل

سبانی "سعدیٰ" وانبری لخصومتی　　وجار ولم یعدل وغاضبنی اھلی

فطلقتھا من جھد ما قد اصابنی　　فھذا امیر المومنین من العدل؟

اس کا خلاصہ مفہوم یہ ہوا کہ "اے صاحب فضل و کرم معاویہ، میں آپکے پاس اسوقت آیا ہوں جبکہ خدا کی زمین مجھ پر بالکل تنگ ہو گئی، اس لئے میری فریاد کو پہونچئے اور میرا حق اس سے دلوائیے جس نے مجھے ان تیروں سے زخمی کیا ہے جن سے زیادہ آسان میرے لئے قتل کیا جانا تھا۔ میں اس سے عدل و انصاف کی توقع رکھتا تھا، لیکن اس نے مجھ پر قید و بند کی مصیبت ڈالدی، اور میری محبوبہ سُعدیٰ کو مجھسے چھین لیا۔ پھر اے امیر المومنین آپ ہی بتائیے یہ کہاں کا عدل و انصاف ہے؟

امیر معاویہ نے اس نوجوان کی یہ دردناک اشعار سنے اور خواہش کی کہ وہ اپنی سرگذشت زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان کرے۔

اس نے جواب میں کہا کہ:۔

"اے امیر المومنین آپ کی عمر دراز ہو۔ میں قبیلۂ بنی عذرہ کا ایک حقیر فرد ہوں اور میری داستان بہت دردناک ہے۔ کچھ زمانہ ہوا جب میری شادی میری بنت عم (چچا کی لڑکی) سے ہوئی اور میں نے اسکی محبت میں، جو کچھ میرے پاس تھا اپنے چچا کی نذر کر دیا۔ جب میرے چچا نے دیکھا کہ میرے پاس سوائے محبت کے اور کچھ نہیں رہا تو اس نے بے التفاتی شروع کی اور اپنی بیٹی سُعدیٰ کو مجبور کیا کہ مجھ سے علیحدہ ہو جائے۔ ہر چند یہ امر اس کے لئے نہایت شاق تھا لیکن اس غیرت و حیا کی وجہ سے جو قبیلۂ بنی عذرہ کی خصوصیت ہے، وہ اپنے باپ کے فرمان کی مخالفت نہ کر سکی اور مجھ سے زیادہ دردمند دل لئے ہوئے وہ اپنے باپ کے گھر چلی گئی۔

میں نے پہلے تو کوشش کی کہ کسی طرح اس غم کے بار کو برداشت کروں، لیکن جب کام صبر و ضبط سے باہر ہو گیا تو میں آپ کے عامل مروان بن الحکم کے پاس گیا اور اس کو اپنی داستان درد سنا کر مداوا چاہا۔ میں سمجھتا تھا کہ وہ اس ظلم کی تلافی کر دے گا جو مجھ پر سُعدیٰ کے باپ کی طرف سے توڑا گیا تھا، لیکن میرا یہ خیال بالکل غلط نکلا۔ کیونکہ جب اس نے میرے چچا اور میری بیوی کو بلا کر دریافت حال کیا تو وہ خود اس کے حسن کا مبتلا ہو گیا اور دس ہزار درہم میرے چچا کو دے کر سُعدیٰ کے نکاح کا پیام دے دیا

میرا چچا جو بہت زیادہ طماع ہے راضی ہوگیا اور مروان بن الحکم نے مجھے بلاکر زندان میں ڈالدیا اور مجبور کیا کہ میں سعدیٰ کو طلاق دیدوں میں نے اول اول تو انکار کیا، لیکن جب میں نے دیکھا کہ اگر میں طلاق نہ بھی دونگا تو وہ کسی نہ کسی طرح اسپر قابض ہوجائے گا اور ادُھر قید کی سختیاں بھی ناقابل برداشت حد تک پہونچ گئیں تو میں نے حد درجہ مجبور ہوکر اس کو طلاق دیدی اور اب اے امیرالمومنین آپ کے دربار میں آیا ہوں کہ میرے اس درد کا مداوا کیجئے۔

یہ کہکر وہ نوجوان بے اختیارانہ طور پر رونے لگا اور اسی حالت میں اس نے یہ شعر برجستہ پڑھے:-

فی القلب منی نار | والنار فیہا استعار
والعین تبدی بشجو | فدمعہا مستدرار
والحب داء عسیر | فیہ الطبیب یحار
حملت منہ عظیما | فما علیہ اصطبار
فلیس لیلی لیل | ولا نہاری نہار

یعنی میرے دل میں وہ آگ بھڑک رہی ہے جس کا کوئی آگ مقابلہ نہیں کرسکتی اور میری آنکھیں جو طوفان اشک لا رہی ہیں اسکا کوئی طوفان مقابلہ نہیں کرسکتا۔ سچ ہے کہ محبت ایسی سخت بیماری ہے جس کا علاج کسی طبیب کے بس کی بات نہیں۔ اور اب میرا حال صبر وضبط کی حد سے اسطرح گذر گیا ہے کہ اب میری زندگی میں نہ دن کا کوئی مفہوم رہگیا ہے نہ رات کا۔

یہ سنکر امیر معاویہ بہت متاثر ہوئے اور اسی وقت ابن الحکم کے نام ایک خط تحریر کرایا جس میں یہ اشعار بھی تھے۔

رکبت امرا عظیما لست اعرفہ | استغفر اللہ من جور امرء زانی
قد کنت تشبہ صوفیا لہ کتب | من الفرائض او آیات فرقان
حتی اتانا الفتی العذری منتحباً | یشکو الی بحق غیر بہتان
ان انت راجعتنی فیما کتبت بہ | لاجعلنک لحما بین عقبان

(مدعا یہ کہ تم نے نہایت سخت جرم کا ارتکاب کیا جس کا علم مجھے ایک نوجوان بنی عذرہ کی فریاد سے ہوا ہے جلد اگر تمنے حکم کی تعمیل نہ کی تو سخت سزا دی جائے گی)

امیر معاویہ نے کمیت اور نصر بن ذبیان کو متعین کیا کہ ابن الحکم کے پاس یہ فرمان لے جاویں اور جلد سے جلد پہونچنے کی ہدایت کی جس وقت یہ فرمان ابن الحکم کے پاس پہونچا تو اس نے پڑھکر ایک ٹھنڈی سانس لی اور کہا "کاش امیر المومنین ایک سال تک مجھے اور سعدیٰ کو اسی حال میں چھوڑ دیتے اور اس کے بعد اگر تلوار سے وہ میری گردن بھی مار دیتے تو مجھے عذر نہ ہوتا"

الغرض نہایت جبر و اکراہ کے ساتھ اس نے سعدیٰ کو طلاق دی اور پیغامبروں کے ساتھ اسے کردیا۔ جس وقت ان لوگوں نے

اسکی صورت دیکھی تو مبہوت ہو گئے کیونکہ انہوں نے بھی آجتک ایسا حسن ساحر نہ دیکھا تھا۔ ابن الحکم نے فرمان معاویہ کے جواب میں جو شعر لکھے وہ یہ تھے:۔

اعذر فانك لو ابصرتها — منك الامانی علی تمثال انسان
وسوف تاتيك شمس ليس يعدلها — عند البرية من انس ومن جان
حوراء يقصر عنها الوصف ان وصفت — اقول ذلك فی سر واعلان

(یعنی میں نے اگر یہ حرکت کی تو معذور تھا کیونکہ اگر آپ اسے دیکھتے تو آپ کا بھی وہی حال ہوتا۔ بہر حال آفتابِ حسن عنقریب آپ کے پاس پہونچنے والا ہے جس کا نظیر روئے زمین پر نہیں ملسکتا بلکہ میں تو یہ کہونگا کہ اگر اسکو حور سے تشبیہ دی جائے تو بھی حقیقتاً اسکی توہین ہے۔)

امیر معاویہ نے ابن الحکم کی تحریر پڑھ کر کہا کہ میں اس کی تعمیل حکم سے خوش ہوا لیکن سُعدیٰ کی تعریف میں اس نے معلوم ہوتا ہے زیادہ مبالغہ سے کام لیا ہے۔ معلوم نہیں نغمۂ موسیقی اور شعر و ادب کا بھی کچھ ذوق رکھتی ہے یا نہیں۔ یہ کہکر امیر معاویہ نے اس کے بلانیکا حکم دیا اور جس وقت وہ سامنے آئی تو سارے بدن میں اک لرزش سی پیدا ہو گئی اور اسی وقت انہوں نے طے کر لیا کہ اس نوجوان کو دولت اور کنیزین وغیرہ دیکر راضی کر لینا چاہیئے، اور سُعدیٰ کو اپنے لئے مخصوص۔

یہ سوچ کر امیر معاویہ نے اس نوجوان کو طلب کیا اور پوچھا کہ "اے نوجوان، کیا کوئی ایسی صورت ہو سکتی ہے کہ تو سُعدیٰ کیطرف سے غافل ہو جائے"

نوجوان۔ "ہاں، اک صورت ہے"

امیر معاویہ۔ "کیا؟"

نوجوان۔ "یہ کہ میرا سر میرے تن سے جدا کر دیا جائے"

امیر معاویہ۔ "میں سُعدیٰ کے عوض تجھے تین نہایت حسین دوشیزہ لونڈیاں دیتا ہوں اس حال میں کہ ہر لونڈی ہزار ہزار دینار رکھتی ہوگی علاوہ اس کے بیت المال سے تیرے لئے اتنی رقم مقرر کر دوں گا کہ تو نہایت امن و سکون سے ان کنیزوں کے ساتھ زندگی بسر کر سکے"

امیر معاویہ ابھی اپنے انعام و اکرام کی فہرست پوری طرح پڑھنے بھی نہ پائے تھے کہ نوجوان چیخ مار کر فرش پر گرا اور ہر شخص نے گمان کیا کہ شاید وہ مر گیا ہے۔ جب وہ کچھ ہوش میں آیا تو امیر معاویہ نے دریافت کیا

"اے اعرابی کیا حال ہے"

نوجوان۔ "اس شخص کا حال آپ کیا پوچھتے ہیں جسکی مایوسی اس حد تک پہونچ چکی ہو، میں سمجھا تھا کہ ابن الحکم کے ظلم کی چارہ جوئی آپ سے کروں گا، لیکن جب آپ بھی اس رنگ کے نکلیں تو پھر اب کہاں جاؤں، زمین سخت ہے آسمان دور ہے

لا تجعلنی والامثال تضرب بی — کالمستغیث من الرمضاء بالنار

اردد سعاد علی حیران مکتئب　　یمسی ویصبح فی ھم وتذکار
قد شفه قلق ما مثله قلق　　واسعر القلب منه ای اسعار
کیف السلو وقد ھام الفواد بھا　　واصبح القلب عنھا غیر صبار

یعنی اے امیر المومنین اپنے طرز عمل سے میرا حال اس شخص کا سا نہ کیجئے جو گرمی سے بھاگ کر آگ کی پناہ ڈھونڈھنے نکلے۔ میری محبوبہ سعاد کو مجھ حیران و مغموم کے سپرد کر دیجئے کیونکہ اسکے درد مفارقت نے مجھ کو زار و نزار بنا دیا ہے اور اب قلب میں صبر کی طاقت باقی نہیں رہی۔"

یہ سن کر امیر معاویہ کو غصہ آیا اور بولے "اے اعرابی تو اقرار کرتا ہے کہ تو نے سعاد کو طلاق دیدی۔ مروان بھی اس کا مقر ہے اسلئے وہ تیرے سپرد کیونکر کیجا سکتی ہے جب تک کہ پھر تیرے ساتھ نکاح نہو، اس لئے اس سے دریافت کرنا ضروری ہے کہ وہ تیرے ساتھ نکاح پر راضی ہے یا کسی اور شخص کے ساتھ" یہ کہکر امیر معاویہ نے ایک مخفی اشارہ سُعدی کیطرف کیا جس سے مقصود اپنے آپ کو پیش کرنا تھا اور دریافت کیا کہ "اے سُعدی، تو کس کو پسند کرتی ہے، امیر المومنین کو جو صاحب عز و شرف ہے، یا ایک اعرابی کو مفلس و محتاج ہے"

سُعدی نے جواب میں اعرابی کی طرف اشارہ کر کے کہا:۔

ھذا وان کان فی فقر واضرار　　وکان فی نقص من الیسار
اکثر عندی من ابی وجاری　　وصاحب الدرھم والدینار

یعنی مجھے تو یہ اعرابی چاہیے جس کا فقر و افلاس مجھے ساری دنیا کی دولت سے زیادہ عزیز ہے۔"

اگر سنہ ۲۹ء میں

آپ نگار کی خریداری کی ابتدا کرتے ہیں، تو شروع سال یعنے جنوری سنہ ۲۹ء کے پرچہ سے ابتدا کیجئے کیونکہ جنوری سنہ ۲۹ء کا پرچہ ۱۶۰ صفحہ پر نکلا ہے اور بہترین نظم و نثر کا مجموعہ ہے۔

منیجر "نگار" لکھنؤ

شیخ الشیوخ حضرت نصیر الدین محمود گنج معانی رحمۃ اللہ علیہ

(بہ سلسلۂ گزشتہ)

مناقب و فضائل کا یہ سلسلہ بہت طویل ہے، مگر ہم اس کو یہیں قلم انداز کرتے ہیں۔

درس و تدریس کا سلسلہ مدینہ منورہ ہی سے شروع ہو گیا تھا، اور سیکڑوں لوگ آپ کے علم و فضل اور سلوک و طریقت کی تاجداری کے باج گزار ہو چکے تھے، چنانچہ جب ہندوستان واپس گئے تو اتنی عقیدت مند ساتھ تھے۔ جن میں بعض شیوخ و علما بھی تھے[1]

دہلی میں بہت پرجوش استقبال کیا گیا، خود حضرت محبوب الٰہی بھی اس میں شریک تھے، خانقاہ پہونچ کر اعلان کیا کہ: نصیر الدین میرے روحانی فرزند اور میرے جانشین ہیں[2]۔ یہ سنتے ہی کھلبلی مچ گئی، بڑے بڑے مریدوں کی امیدیں خون ہو گئیں، ساری محفل سراپا رشک و تعجب ہو گئی۔ یہ اعلان معمولی اعلان نہ تھا ہمیں اس کو اسی رشک و تعجب کی روشنی میں دیکھنا چاہئے۔ اس سے ہم شیخ محمود کے جوہر فضل کا صحیح اندازہ کر سکینگے۔

حضرت محبوب الٰہی کی بزم سلوک جن لوگوں سے آراستہ ہوتی تھی۔ اس میں ہر شخص علم و فضل کا رازی و غزالی، اتباع سنت و سیر کا ابن تیمیہ و ابن حنبل، شعر و ادب کا ابو تمام و ابن رشیق، اور سلوک و طریقت کا جنید و شبلی تھا۔ مثلاً کمال الدین زاہد، رضی الدین عراقی۔ شرف الدین کرمانی، ضیاء الدین رومی، ابوبکر عدسی، شیخ نور ترک، مخلص الدین، امیر خسرو، حسن ملائی، شیخ تقی الدین، برہان الدین نسفی، شیخ شہاب الدین قاضی منہاج، شیخ احمد، قطب الدین منور، حسام الدین ملتانی، فخر الدین زرادی، شمس الدین یحییٰ، وجیہہ الدین یوسف، محی الدین کاشانی، فخر الدین مزوری، علاء الدین نیلی، وجیہہ الدین بائلی، رکن الدین اصولی، صدر الدین نادی، ظہیر الدین بھکری، حسن افغان وغیرہ۔ تاہم باوجودیکہ آپ سب کے بعد آئے مگر سب سے آگے بڑھ گئے۔ حضرت محبوب الٰہی نے اپنی زندگی ہی میں سجادۂ ارشاد و ہدایت سونپ دیا، اور اپنے پرانے پرانے لوگوں میں کوئی بھی اس قابل نہ سمجھا گیا کہ اُسے مسند محبوبیت پر سرفراز کیا جائے۔

تم جانتے ہو کہ اس سرفرازی کی کیا وجہ تھی؟ اگر کامیابیوں کا انحصار محض اللہ کے فضل و کرم پر ہے، تو یہ کیسا فضل و کرم تھا کہ ایک نیا شخص تو قبول کر لیا گیا، اور پرانے شعلہ آشام رد کر دیئے گئے؟ اور اگر انسان کے علم و عمل اور استحقاق کو بھی کچھ دخل ہے، تو ان لوگوں میں بڑے بڑے عالم اور بڑے بڑے زاہد و مرتاض جو شیخ کے مستحقین بھی تھے، ان کی تمناؤں پر نامرادیوں کا قلم کیوں پھیر دیا گیا؟

لیکن یہی رد و قبول ہے جس نے وہ عظیم الشان مگر غیر محسوس فرق نمایاں کر دیا ہے۔ ان سلاطین علم و تقوی میں ایک شخص بھی ایسا نہ تھا جو علم و فضل، زہد و تقوی اور جاہ و دولت کے ساتھ عشق و محبت، محنت و جفاکشی، اعتقاد و اخلاص، صدق و دیانت، انقیاد و فنادگی،

---

[1] سیرت المحمود ۱۲ [2] سیرت المحمود ۱۲

ایثار و ستر بانی بے نیازی و سیر چشمی اور صبر و استقامت کے خزانوں کا ایک سکہ بھی اپنے پاس رکھتا ہو۔ مگر شیخ محمود مصر سلوک کے وہ تنہا یوسف تھے، جو اس دولت حسن کے عظیم الشان سرمایہ دار تھے۔ اور یہی وہ خوبی و زیبائی تھی جس نے آپ کو سب سے آگے بڑھا دیا، اور ہفت اقلیم کی شہنشاہی کا تاج آپ کے سر پر رکھ دیا۔

ایک روز حضرت محبوب الٰہی پر ایک خاص کیفیت طاری تھی، فرمایا: اجابت کے دروازے کھلے ہیں، جسکی جو خواہش ہو کہے" ہر شخص نے اپنے اپنے مطالبات پیش کئے۔ کسی نے دنیا چاہی، کسی نے عقبیٰ اور کسی نے دونوں۔ مگر آپ کا مقصد دنیا و عقبیٰ سے بلند تر تھا، کچھ نہ بولے۔ شیخ نے کہا تم بھی تو کچھ کہو، کیا چاہتے ہو؟ بولے: بندہ را خواستی نہ باشد، خواست خواست مولی باشد" حضرت محبوب الٰہی نے یہ سنکر منھ چوم لیا، اور کہا: واللہ یہی چیز ہے جس نے تم کو سب سے بڑھا دیا ہے۔ (حکایات الصالحین)

عزت اور قبول عام کی یہ کیفیت تھی کہ امراء، علماء، اور مشائخ خدمت شریف میں حاضر رہتے، اور نہایت خلوص و اعتقاد سے زمین ادب کو بوسہ دیتے تھے۔

لیکن آپ کے اخلاق و عادات میں ذرہ برابر فرق نہ آیا، وہی انکسار جو پہلے تھا اب بھی قائم رہا۔

خادم جو رات دن خدمت اقدس میں حاضر رہتے تھے، کہتے ہیں: آپ ہی نے ہمارے زیادہ کام کردئے ہوں گے، ہم نے آپ کے اتنے کام نہیں کئے۔ محلے والوں کے کام کاج ان کے گھروں پر جا جا کر اور پوچھ پوچھ کر کردیتے تھے (روضۃ الاخیار)

والد سے ترکہ میں کئی ہزار ایکڑ زمین، باغ اور مکانات ملے تھے، جن کی سالانہ آمدنی کئی ہزار اشرفی تھی۔ لیکن آپ اس سے ایک پیسہ بھی نہیں لیتے تھے۔ نقد و جنس کا اندازہ دو ڈھائی لاکھ تھا، مگر وہ سب راہ خدا میں صرف کردیا۔ سیرت المحمود میں لکھا ہے:-

حضرت شیخ را دو باغ و ہشت ہزار ایکڑ زمین وسی و پنج مکانات بود، اما آنحضرت یک فلوس نگرفتے۔ نقد و جنس کہ اندازہ آں از یاد از دو لکھ بود، بخلق اللہ انفاق نمود"

تذکرۃ الفضلا کی شہادت :-

باین ہمہ کہ او دولت فراواں داشتے، اما بر وجود خود یک حبہ صرف نہ کردے، و بر خلق بخشش ہائے بے اندازہ کردے"

یہ سب دے دلا کر اپنی معاش کے لئے، خود اپنے قوت بازو سے کما کر تلوکھڑی میں تھوڑی سی زمین خرید لی تھی اس پر کچھ ساگ پات اور اناج بو لیتے تھے۔ لیکن اکثر ایسا ہوتا تھا کہ غربا و مساکین کی تواضع کردیتے تھے۔ اور خود بجائے غذا کے پانی کے گھونٹ پر اکتفا کرتے۔ حکایات الصالحین میں لکھا ہے:۔

"برائے معاش خود در تلوکھڑی یک دو طناب زمین خریدہ بدست مبارک می کاوید و تخم می ریخت و قوت لایموت ازاں می ساخت"

اپنے کسی کام کے لئے کسی کو تکلیف نہیں دیتے تھے۔ کھانا پکانا۔ کپڑے دھونا، اور سینا پرونا سب کام خود ہی کرلیتے تھے کھانے میں ابلا ہوا بغیر نمک مرچ کا ساگ، اور جو کی روٹی ہوتی تھی (حکایات الصالحین)

ہمدردی و غمخواری کا ایسا جذبہ تھا کہ کسی کو مبتلائے مصیبت نہ دیکھ سکتے تھے۔ انسان تو انسان جانوروں کی تکلیف و مصیبت سے بھی متاثر ہو جاتے۔ ایک دفعہ ایک شخص گھوڑے پر سوار جا رہا تھا، اس نے گھوڑے کو اس زور سے چابک مارا کہ اس کی گردن پر بدھی پڑ گئی۔ آپ یہ دیکھ کر تلملا اٹھے اور اسے گھوڑے سے اتار لیا (سیرت المحمود)

فقر و فاقہ اور توکل و قناعت کا یہ عالم تھا کہ نہ عزیز و اقارب کی محبت کی پرواہ کرتے تھے نہ جاہ و عزت کی، یہ دونوں جادو آپ پر بالکل بے اثر تھے۔ کئی دفعہ ایسا ہوا کہ دنیا کی عزتیں اور نعمتیں پری پیکر عروس بنکر سامنے آئیں، مگر ایک غلط انداز نظر بھی نہ پا سکیں۔ محمد تغلق کے دوستوں نے اپنے جال میں پھنسانا چاہا اور عزیزوں نے بھی بہت کوشش کی، مگر یہ عنقا کسی دام میں نہ آیا۔ انھوں نے زیادہ اصرار کیا تو صاف کہدیا کہ: جاتے ہو اس کا کیا نتیجہ ہوگا؟ تم میرے ایمان سے اپنی قرابت کو ٹکرانے کی کوشش نہ کرو، جو دل خدا کا ہو چکا ہے وہ اب بندوں کا نہیں ہو سکتا۔ یہ چھوٹی اور ذلیل عزتیں تمھارے نزدیک کچھ ہوں، لیکن مجھے اپنی طرف مائل نہیں کر سکتیں (سیرت المحمود)

حضرت محبوب الٰہی سے ایسا خلوص تھا کہ جب یہ سنا کہ سلطان تغلق ان سے پرخاش رکھتا ہے، تو خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے ایک بڑے ابتلا سے بچا لیا (روضۃ الاخیار)

دوست احباب اور ملنے جلنے والوں سے نہایت سادگی و بے تکلفی سے ملتے تھے۔ نہ کسی سے یہ خواہش کی کہ وہ جھک جھک کر سلام کرے، اور نہ یہ چاہا کہ جب آئے ہاتھ پیر چومے۔ بلکہ جو لوگ ایسا کرتے انھیں منع کر دیتے کہ یہ باتیں خلاف شریعت ہیں (روضۃ الاخیار)

شاگردوں اور عقیدتمندوں کے ساتھ برادرانہ سلوک کرتے تھے، اور کسی سے ناجائز احترام و عقیدت کے روادار نہ تھے۔ ان میں جو بیمار پڑ جاتا روز اس کی عیادت کو تشریف لیجاتے، اور بعض اوقات ایسا ہوتا تھا کہ تیمارداری بھی کرتے اور اپنے ہاتھ سے دوائیں پیس پیس کر پلاتے تھے۔ نیعفر کی بیماری میں ایک مہینہ تک نوکروں کی طرح ان کی خدمت کی، اور شیخ صدرالدین کی عیادت کو روزانہ کئی میل پیدل چل کے جاتے تھے۔ سیرت المحمود میں اس قسم کے اور بہت واقعات لکھے ہیں۔

حضرت محبوب الٰہی کے مریدوں سے بہت تپاک سے ملتے تھے (حکایات الصالحین) حمید قلندر ان کے مرید اور آپ کے شاگرد تھے۔ لیکن آپ کو یہ بات معلوم نہ تھی۔ ایک روز کسی نے اس نسبت سے قلندر کا ذکر کیا، وہ آئے تو فرمایا: "تو مرید شیخی؟ من نمی دانستم، بیا کنار گیرم" (اخبار الاخیار)

محنت و ریاضت کی اتنی شدت تھی کہ ہمیشہ روزہ رکھنے کے ساتھ دو کلام اللہ روزانہ ختم کرتے، اور دوسرے اوراد و وظائف کے علاوہ تین لاکھ مرتبہ درود پڑھتے تھے۔ اشغال و مراقبے اس سے علٰحدہ رہے۔ سید محمد کہتے ہیں: میں برسوں خدمت عالی میں حاضر رہا ہوں لیکن کبھی ایک گھنٹہ سے زیادہ رات کو سوتے نہیں دیکھا (سیر الاولیا)

شریعت کی پابندی کا بیحد خیال تھا، ہمیشہ اس بات کے کوشاں رہتے کہ مریدوں اور دوستوں میں کوئی شخص اعتصام سنت اور تخلق باخلاق الانبیا میں کمزور نہ ہو، اسی غرض سے ارشاد و ہدایت اور تعلیم و تدریس کا سلسلہ شروع کیا، امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے مقدس فرائض انجام دینے کے لیے شیوا زبان اور بلند آہنگ داعی طیار کیے، اور ایک ایسی صادق العمل پرجوش جماعت پیدا کر دی کہ خانقاہیں ایک بار

پھر کلمۃ الحق کی پکاروں سے گونج اٹھیں، اور چشتی دعوت طریقت کو حیات تازہ مل گئی (سیرت المحمود وحکایات الصالحین) اس بارے میں آپ کی مساعئ جمیلہ ہندوستان کے ارباب طریقت سے بہت زیادہ ہیں، سلوک چشتیہ ہمیشہ آپ کے احسانات کو یاد رکھے گا۔

سماع چشتیہ سلوک میں روحانی نماز سمجھا جاتا ہے، خصوصاً اس زمانہ میں تو یہ نماز اتنا ہی جیسا فرض ہوگئی تھی۔ لیکن آپ ایک دفعہ بھی اس روحانی نماز میں شریک نہ ہوئے، اور سختی سے اس نماز کے شیوخ کی مخالفت و ممانعت کی۔ گو بعض سماع پرست تذکرہ نویسوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ آپ بھی سماع کے دلدادہ تھے لیکن یہ سراسر اتہام ہے۔ اس بارے میں آپ کا مسلک سب سے علحدہ تھا۔ داراشکوہ نے لکھا ہے:-

"باوجود آنکہ دریں سلسلہ سرود و سماع می کردند اما شیخ نصیر الدین سماع نمی فرمودند، و می گفتند کہ خلاف سنت است"

(سفینۃ الاولیا مطبوعہ لاہور صفحہ ۱۷۱)

ایک روز حضرت محبوب الٰہی کے حضور سماع ہو رہا تھا، آپ تشریف لائے، اور سماع کی آواز سنتے ہی الٹے پیروں واپس چلے گئے۔ (روضۃ الاخیار)

ایک دفعہ حضرت محبوب الٰہی کے یاران بزم کی ایک صحبت میں آپ بھی رونق افروز تھے۔ وہاں سماع شروع ہوگیا، آپ اسی وقت اٹھ گئے سب نے بہت روکا، مگر آپ نہ ملنے۔ فرمایا: خلاف سنت ہے۔ انھوں نے کہا: کیا سماع سے منکر ہو کر اپنے پیر کے مشرب سے علحدہ ہوگئے؟ فرمایا حجت نہیں ہے، دلیل کتاب و سنت سے ہونی چاہئے۔ یہ واقعہ خیر المجالس میں لکھا ہے اس کے اصل الفاظ یہ ہیں:-

"روزے بعضے از مریدان شیخ نظام الدین اولیا مجلسے داشتند۔ و از دف زناں سرودے می شنیدند۔ شیخ نصیر الدین در مجلس بود برخاست تا برآید۔ یاراں تکلیف نشستن کردند، گفت خلاف سنت است۔ گفتند از سماع۔ سماع منکر شدی؟ و از مشرب پیر برگشتی؟ گفت حجت نمی شود، دلیل از کتاب و سنت می باید۔"

دوست دشمن سب کے ساتھ آپ کی مراعات یکساں تھیں۔ مولانا معین الدین عمرانی اپنے وقت کے ایک جید عالم تھے اور جیسا کہ اکثر ظاہری علماء اہل اللہ سے پرخاش رکھتے ہیں، یہ بھی حضرت محمود سے پرخاش رکھتے تھے، اور بلاوجہ بدگوئیاں کرتے تھے۔ مولانا خواجگی کو دونوں بزرگوں سے علاقہ تھا، وہ آپ کے مرید اور اُن کے شاگرد تھے۔ لیکن مولانا کو یہ نسبت بہت ناگوار تھی، جب موقع ملتا جی بھر کے گالیاں دیتے تھے خواجگی نے چاہا کہ مولانا سے نسبت منقطع کرلیں مگر شیخ نے منع کردیا۔ قضارا ایکدفعہ مولانا نہایت شدید سفرا میں مبتلا ہوئے، اور کئی مہینے بیمار رہنے کے بعد بھی تندرستی کی نوبت نہ آئی۔ علاج سے عاجز آگئے تھے، اور مرض دن بدن بڑھتا جاتا تھا، خواجگی نے کہا: اگر مخدوم شیخ کی ملاقات کو تشریف لے چلیں تو مضائقہ نہیں ہے۔ شاید شفا کی کوئی صورت نکلے۔ مولانا پہلے تو بہت چیں بجبیں ہوئے، لیکن پھر تکلیف کی وجہ سے تیار ہوگئے شیخ نہایت لطف و محبت سے ملے، بغل گیر کیا، اور اسی وقت خادم کو حکم دیا کہ چانول اور جغرات تیار کرے۔ دستر خوان چنا گیا تو مولانا کے آگے چانول اور جغرات کی قاب رکھی گئی۔ مولانا نے شیخ کے اصرار سے مجبور ہو کر چند لقمے کھائے۔ لیکن یہ کھانا تھا کہ صفراوی مادہ میں ہیجان آگیا، اور پیہم استفراغوں سے اتنی بُری حالت ہوگئی کہ مولانا کے ہوش و حواس اڑ گئے۔ اور انھوں نے سمجھ لیا کہ بس آج زندگی کا خاتمہ ہے مگر یہ زہر دراصل تریاق تھا۔ تھوڑی دیر بعد ایک عرق پلایا، اور اس کے پیتے ہی مولانا بالکل صحیح و تندرست ہوگئے۔ اس واقعہ نے اُن کے

ں سے زنگ کدورت دھودیا حسد کی آگ بجھ گئی اور وہ خلوص و اعتقاد کے ساتھ بیعت ہو کر شیخ کی خدمت میں رہنے لگے (سیرت المحمود)

درس و تدریس کا سلسلہ اخیر عمر تک جاری رہا عہد سلوک کے تلامذہ کی تعداد تو حد شمار سے باہر ہے لیکن بعد کے طلبہ بھی سینکڑوں سے تجاوز ہیں چند نام یہ ہیں: برہان الدین - شیخ عثمان، شاہ علی، عزیز الدین، سید محمد کرمانی، خواجہ شمس الدین، حمید قلندر، ضیاء برنی، نظام الدین یرازی، میر جعفر، موید الدین، شمس الدین دہاری، عثمان سیاح، شیخ ابوبکر، مولانا مظہر، شیخ شہاب الدین، سید محمد گیسو دراز، شیخ احمد، مولانا اجگی، سید جلال الدین، شیخ صدر الدین حکیم، سید ابو یوسف، قاضی عبد المقتدر، شیخ زین الدین - مخدوم جہانیاں - کمال الدین علامہ خ اخی سراج پروانہ - یہ لوگ علم و فضل میں شہرہ آفاق اور اقلیم فقر و فنا کے تاجدار تھے اور حضرت محمود نے ہندوستان کے مختلف صوں کی عنان نظم ان کو تفویض کی تھی (سیرت المحمود وغیرہ)

آفتاب کی روشنی ایک ہوتی ہے - لیکن ہر جگہ اس کے اثرات ایک نہیں ہوتے - اس آفتاب علم و طریقت کے جلوے بھی رنگ برنگ ہیں ر جگہ ایک نئی اور مکمل شان ہے - صفحات میں گنجائش نہیں کہ مفصل طور پر اس کا بیان ہو سکے - لیکن یہ کہنا ایک اہم ترین فرض ا کرنا ہے کہ آپ کی یہی وہ ادائیں تھیں جن کی وجہ سے ایک دنیا نے نیازمندانہ سر جھکا دیئے تھے، ہندوستان سے روم و شام اور مصر و روان تک گنج معانی، چراغ دہلی اور شیخ الاسلام کا ڈنکا بج گیا تھا - خود حضرت محبوب الٰہی بھی آپ کو انھیں ناموں سے پکارتے تھے مراۃ الاسرار س لکھا ہے :-

"از کثرت فضل و دانش و قیام امر بالمعروف و نہی عن المنکر شیخ المشائخ اورا گنج معانی، و شیخ الاسلام می گفتند"

مخدوم جہانیاں کہتے ہیں: میں جس زمانہ میں مکہ معظمہ میں مقیم تھا ایک روز شیخ عبد اللہ یافعی سے ملاقات ہوئی - انہوں نے کہا لی اب صرف ایک چراغ رکھتی ہے - میں نے پوچھا وہ کون ہے: بولے: شیخ نصیر الدین (سیرت المحمود)

تاریخ فرشتہ میں بھی اس کے متعلق ایک روایت لکھی ہے - ایک روز حضرت محبوب الٰہی کے پاس دور دور کے مشائخ کا مجمع تھا آپ ے اور اُن کو چاروں طرف بیٹھا دیکھ کر کھڑے رہ گئے - شیخ نے فرمایا بیٹھو؟ بولے: درویشوں کی طرف پشت ہوتی ہے - شیخ نے کہا: چراغ را شت و روئے نیست" اس روز سے چراغ دہلی مشہور ہو گئے - شیخ صدر الدین، حمید قلندر، میر جعفر، مولانا مظہر، عثمان سیاح، قاضی بد المقتدر - جہان گشت کہتے ہیں ہم جہاں جاتے تھے حضرت محمود کا ذکر سنتے تھے، اور ہر جگہ کے علماء و مشائخ بہت تعظیم و تکریم سے نام یتے تھے (فرشتہ جلد دوم صفحہ ۴۱۱ مطبوعہ لکھنؤ)

ہر صدی کا ایک مجدد اور فائق ہوتا ہے، اس صدی کے مجدد اور فائق آپ تھے کیونکہ آپ نے صرف حجرہ و خانقاہ ہی کے کام نہیں کئے مدرسہ و منبر کے بھی کام کئے، اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی عملی کوششوں میں سب کو مات کر دیا - اور تجدید و تاسیس کے مدارج آپ نے حد درجہ ن کے ساتھ طے کئے۔

کہنے والوں نے یہ بالکل سچ کہا ہے کہ شیخ نصیر الدین ہمارے زمانہ کے لئے رحمت و برکت ہیں - ان کا وجود اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم کا ایک نشان - ان کی جامعیت نے سلوک و شریعت کو الگ ہونے اور ٹکرانے سے روک لیا ہے - وہ بظاہر ایک متشرع عالم ہیں - لیکن بہ باطن اپنے وقت کے

شبلی و جنید ہیں۔ ان کی ذات ہمارے لئے ایک نعمت غیر مترقبہ ہے، وہ ایک ہی وقت میں امام ابن تیمیہ بھی ہیں اور شیخ عبدالقادر جیلانی بھی وہ اس دور کے مجدد، اس عصر کی روح، اور اس صدی کے زندہ کرنیوالے ہیں۔ ہم نے ان کا نظیر نہ دیکھا نہ سُنا۔ حسن بصری و بایزید بسطامی کے حالات کتابوں میں پڑھتے ہیں، لیکن شیخ محمود کو رات دن اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ (یہ مختلف بزرگوں کے اقوال ہیں جو سیرت المحمود وغیرہ میں نام بنام لکھے ہیں۔) مگر میں سوائے اس کے اور کیا کہوں۔ کہ ع

اے تو مجموعۂ خوبی بچہ نامت خوانم!

اس زمانہ کے اکثر شعرا نے آپ کی مدح میں قصائد بھی لکھے ہیں۔ یہ تمام قصائد احمد الدین نامی ایک مرید نے ایک کتاب کی صورت میں جمع کئے ہیں، کل (۱۰۵) قصیدے ہیں، ۳۸ عربی میں ہیں اور باقی فارسی میں۔

لیکن مشیت کی عجب نیرنگیاں ہیں، ایک طرف تو آپ کی دلربائیاں عالمگیر ہو رہی تھیں، ہندوستان سے گزر کر تمام عالم اسلامی میں آپ کا سکہ چل رہا تھا۔ دوسری طرف مصیبتیں گھر گھر آ رہی تھیں۔ محمد تغلق کی دوستیاں دشمنی سے بدل رہی تھیں۔ اور ابتلاء و آزمائش کا نہایت سخت زمانہ آ رہا تھا۔ مگر یہ بھی بلندی فطرت کا ایک پیمانہ تھا، مصیبت کی اس آگ نے اس طلاء احمر کی پوشیدہ حقیقتیں عالم آشکارا کر دیں۔

ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں میں سلطان محمد تغلق اپنے علم و فضل، دانش مندی و نیک نفسی، علو خیال اور عزم و ارادہ کی وجہ سے ایک خاص امتیاز رکھتا ہے۔ لیکن یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ وہ نہایت فخر پسند مغرور اور طالب جاہ بھی تھا۔

ممکن ہے سلاطین اسلام میں اور بادشاہ بھی اس خو بو کے گزرے ہوں، لیکن عام اخلاق میں جو حیرت انگیز تشابہ صلاح الدین، منصور اور محمد تغلق میں ہے، دوسرے بادشاہوں میں نہ ہوگا۔ صلاح الدین نے شیخ الاشراق کو بڑھایا، منصور نے ابن رشد کی دماغی پرورش کی، تغلق نے شیخ محمود کی قدر دانی کر کے علماء ہند کا محسود بنا دیا۔ لیکن پھر کیا ہوا خندۂ لب چین جبیں سے بدل گیا۔ جنھوں نے رفعت و سربلندی کی قبائیں پہنائی تھیں، پھر انھیں نے تباہی و بربادی کی زنجیریں بھی ڈالیں۔ صلاح الدین نے شیخ الاشراق کو قتل کیا، منصور نے ابن رشد کو تباہ کیا، محمد تغلق نے شیخ محمود کو تکلیفیں دیں، اور جب تک زندہ رہا دشمنی سے باز نہ آیا۔

چونکہ محمد تغلق زمانۂ شہزادگی سے آپ کا بیحد دوست تھا اور دوستی کے بعد ایسی شدید دشمنی ایک حیرت انگیز واقعہ ہے اس لئے تذکرہ نویسوں نے اس کے اسباب کی تحقیق میں بہت جد و جہد کی ہے، اور ہر ایک نے مختلف اسباب بتلائے ہیں، ہم یہاں سب کا خلاصہ درج کرتے ہیں۔

تغلق گو ابتداء سے نہایت فخر پسند اور مغرور تھا، لیکن شہزادگی میں یہ باتیں دبی رہیں، مگر جب وہ سلطان ہوا تو یہ باتیں بھی سلطان ہو گئیں۔ شیخ محمود پہلے تو اسکی (ایک حد تک) من مانی عزت کرتے تھے، لیکن بے نیازی کا دور آنے کے ساتھ ہی بیجا عزت و حرمت چھوڑ دی اب وہ اسکو دوست من اور عزیز من وغیرہ الفاظ سے مخاطب کرتے تھے، جو اسکو بہت ناگوار گزرتا تھا (سیرت المحمود)

جب اس نے دیوگیر کو مرکز سلطنت بنانا چاہا، تو آپ سے بھی درخواست کی کہ مع اپنے تلامذہ و مریدین کے تشریف لے جائیں لیکن آپ نے انکار کر دیا (سیرت المحمود)

اسی طرح جب وہ چنگیزیوں کے مقابلہ میں خراسان و ترکستان پر یلغار کرنا چاہتا تھا، اور عام مسلمانوں کو ابھارنے کی غرض سے تمام

و مشائخ کو دعوت دی، تو خاص طور پر آپ سے کہا کہ: ما می خواہیم کہ آں چنگیز ملعون را بر اندازیم، حضرت شیخ با ما دریں کار موافقت خواہید
د" آپ نے کہا میں تیار ہوں، لیکن پہلے گھر کا تو انتظام کر لو، ملک قحط کی مصیبت سے تباہ ہوا جا رہا ہے (سیرت المحمود)

ایک دفعہ آپ مہرولی جا رہے تھے، راستہ میں تغلق کی سواری مل گئی، آپ اس کو دیکھکر دوسری طرف ہو گئے، اتفاق سے زین الدین۔
ن الملک کی نگاہ پڑ گئی، اس کو آپ سے خصومت تھی؛ سلطان سے بولا: شیخ نصیر الدین ابھی اس راہ سے جا رہے تھے، لیکن کو کبۂ سلطانی کو
کر پھر گئے (اخیار الاولیا)

ایک روایت یہ بھی ہے کہ تغلق نے ایک دفعہ حریر و اطلس کے چند تھان، اور کئی ہزار اشرفیوں کی تھیلی آپ کے پاس بھیجی۔ آپ نے حسب عادت
سے انکار کر دیا (سیر الاولیا)

ان سب پر مستزاد اس کا حضرت محبوب الٰہی سے عناد رکھنا، اور اس عہد کے صوفیا، و مشائخ پر ظلم و ستم تھا۔ جس سے آپ اسکو
روکتے تھے، اور کئی دفعہ صاف لفظوں میں کہہ چکے تھے کہ:- بادشاہوں کے لیئے جو اخلاق ضروری ہیں، افسوس ہے کہ تم ان سے
چھوٹے جاتے ہو۔ استقلال نام کو نہیں، کانوں کے کچے، ظلم و ستم میں شیر، درویش آزاریوں کے خوگر ہو۔ غرور و خود پسندی تمہاری
ت اور نخوت و کینہ پروری تمہارا شیوہ ہوتی جا رہی ہے۔ میں تم کو کئی دفعہ ان بری عادتوں سے روک چکا ہوں، مگر دیکھتا ہوں
س اس طرف ذرا التفات نہیں۔ بری عادتوں میں روز بروز زیادتی ہے، اور تم بجائے سلطانی و فرماں روائی کے سزاوار بننے کے
یدان نا قابل بنتے جاتے ہو۔ کاش تمھیں اب بھی ہوش آئے، اور یہ بری عادتیں تم سے چھوٹیں۔ ورنہ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ زمانہ اپنا رنگ
اور اس بلندی کو پستی دیکھنی پڑے (سیرت المحمود و تذکرۃ الفضلا)

بہر حال ان وجوہ سے محمد تغلق آپ کا جانی دشمن ہو گیا تھا، اسپر مخلص الملک، نوازش علی اور محمد عمر کی چغلیاں گویا جلاد کے ہاتھ میں تلوار تھیں
لگائی بجھائی سے ان کی پیاس اور بڑھتی جاتی تھی، اور وہ یہ چاہتا تھا کہ کسی حیلۂ شرعی سے شیخ کا قصہ پاک کر دے۔

ایک دفعہ شیخ کو مع احباب و موالی مدعو کیا، سونے چاندی کے برتنوں میں کھانا چنا گیا کہ اگر ان برتنوں میں کھانا کھا لیا تو فعل نا مشروع
سزا دی جائے گی، اور اگر انکار کیا تو قبول دعوت سے انکار کا جرم لگایا جائیگا۔ مگر آپ نے کعبہ و بتخانہ کے بیچ سے راہ نکال لی، طشتریوں میں
نے کے بجائے تھوڑے سے چانول ہتھیلی پر رکھ کر کھا لئے، اور سب نے اسی کا اتباع کیا۔ تغلق افسوس سے ہاتھ ملنے لگا۔ (اقتباس الانوار)

اسی طرح اور مختلف طریقے اختیار کئے، کبھی مسائل میں گفتگو کی، کبھی اعتقادات پر بحث کی، کبھی تفسیری مباحث چھیڑے، کبھی علم کلام
ظرہ کیا، کبھی صوفیا، کرام پر اعتراضات کئے، کبھی حضرت محبوب الٰہی کی بدگوئیاں کیں۔ کبھی اپنے دربار کے دو لا مذہب عالموں
نطقی و علم الدین فلسفی) کو بحث کے لئے آگے کر دیا؛ مگر آپ اپنے علم و فضل اور دانش و فراست سے ہر منزل سے کامیابی کے ساتھ
رہے (سیرت المحمود)

جب وہ اپنے تمام اوچھے وار ختم کر چکا، تو اب اس نے اپنے ترکش سے آخری تیر نکالا۔ یہ تیر خدمت و چاکری کا تیر تھا
ر الاولیا میں لکھا ہے:-

سلطان محمد تغلق، حضرت شیخ نصیر الدین را بایں کمال ہست کہ داشت از راہ عناد ایذا ہا کردے، و در سفر ہمراہ خود گردانیدے، وقتے اورا جامہ دار خود گردانیدہ بود"

تاریخ فرشتہ بھی کہتا ہے کہ :-

" شیخ نصیر الدین محمود در تکلیف جامہ پوشانیدن نمود" (سیرۃ المحمود جلد دوم)

یہ سنکر مرید و شاگرد در تمام عقیدت مند بہت برافروختہ ہوئے، اکثر غصہ میں آپے سے باہر ہو گئے، تیوریاں بدل گئیں، نیاموں سے تلواریں نکل آئیں - مگر جو شورش و ہنگامہ کا دشمن ہو، جو فساد و خوں ریزی سے اللہ کی زمین کو پاک کر دینا چاہتا ہو، اور جس کا مقصد نیکی و راستی، صدق و محبت اور امن و خدا پرستی کے پاک جذبات سے دنیا کو لبریز کر دینا ہو، اور جس نے اپنی ساری زندگی میں گالیاں سن سنکر، اور مصیبتیں سہ سہ کر انسانیت کی خدمت کی ہو، وہ ان باتوں کو کب گوارا کر سکتا تھا - فرمایا :- میرے دوستو میں نہیں چاہتا کہ میرے لئے کسی مسلمان کے خون کا ایک قطرہ بھی بہے - خدارا محمود پر رحم کرو، اسے روز حشر کی پرسشوں سے بچا لو وہ اس روز اس ہنگامہ آرائی کا کوئی جواب نہیں دے سکیگا - واللہ یہ گناہ کفر سے زیادہ ہے - مسلمان کو فتنہ انگیزی سے بچنا چاہئیے، تم اس کی طرف لپکتے ہو، مسلمان کا کام امن و عافیت پھیلانا ہے، لیکن افسوس کہ تم دعوی اسلام کے ساتھ فساد کو پھیلاتے ہو، مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان محفوظ رہیں، لیکن آہ کہ تمھاری جلد بازیاں تمھارے ہاتھ خون سے رنگنا چاہتی ہیں - اور تم وہ کام کرنے پر تل رہے ہو جس کے تصور سے میری روح کانپتی ہے - مجھے بتلاؤ تمھاری ناراضی کی وجہ کیا ہے؟ کیا میرا خدمت کرنا اسلام کے خلاف ہے کیا اس سے خدا کی وحدانیت، رسول کی رسالت اور قیامت کے برحق ہونے کا انکار لازم آتا ہے؟ اگر یہ نہیں ہے تو پھر کیا ہے جس کے لئے تمھاری چٹکیاں تیر پھینکنے پر بے تاب ہیں - کیا ہزاروں آدمیوں کا خون بہنے، اور مدتوں قید و بند کا سلسلہ جاری رہنے سے یہ بہتر نہیں ہے کہ میں خوشی خوشی سلطان کی خدمت کے لئے تیار ہو جاؤں؟ سوچو، سمجھو اور اپنی جان ہلاکت میں نہ ڈالو - میری خوشی یہی ہے کہ تم مجھے میرے حال پر چھوڑ دو، اور اطمینان و یکسوئی سے اپنے اپنے کاموں میں مشغول رہو، یاد رکھو بادشاہ کی اطاعت معصیت کے سوا ہر حال میں فرض ہے - خواہ اس سے کسی کو تکلیف ہو یا خوشی - جماعت کے مقابلہ میں اشخاص کوئی چیز نہیں ہیں -

اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم، فان تنازعتم فی شیء فردوہ الی اللہ والرسول،

پھر تمھیں کیا منظور ہے؟ صاف صاف کہدو کہ تم میرے دوست ہو یا دشمن؟ میری روح کو تکلیف دینی چاہتے ہو یا خوشی؟ اسی فیصلہ پر میرے تمھارے تعلقات کا انحصار ہے (یہ تقریر سیرت المحمود - اخبار الاولیا اور تذکرۃ الفضلا میں بہ تغیر الفاظ لکھی ہے - میں نے الفاظ کو چھوڑ کر تینوں کا مفہوم لیا ہے) سب نے گردنیں جھکا لیں تلواریں اور کمانیں پھینکدیں - اس کے بعد آپ دربار میں تشریف لے گئے، وہاں سب آپ کے منتظر تھے، سلام مسنون کے بعد آپ نے تغلق سے کہا : میں خدمت کیلئے تیار ہوں مجھے اس سے بھی انکار نہیں ہے کہ دربار مجھ سے ذلیل سے ذلیل کام لے میں اس کے لئے بھی مستعد ہوں کہ سلطان مجھے مشرق سے مغرب تک دوڑنے کا حکم دے، مجھے اس میں بھی تامل نہیں ہے کہ فلک بوس بلندیوں سے کودنے کا حکم دیا جائے میں اس کے لئے بھی آمادہ ہوں کہ بادشاہ پر

اپنے تئیں نثار کر دوں۔ لیکن اے میرے دوست! کیا تم اپنے جاں نثار کی ایک بات قبول کروگے؟ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم اپنے اندر اخلاقِ حسنہ پیدا کرو۔ تغلق یہ آخری الفاظ سنکر اثر میں ڈوب گیا اور کہتے ہیں کہ کئی دن اس اثر میں ڈوبا رہا (سیرت المحمود) مگر افسوس وہ بہت ہی کمزور تھا، نفس اس پر حاوی ہوگیا۔ مگر وہ اس پر قابو نہ پاسکا۔ اس کے دل سے راستی کا جذبہ تیر کی طرح نکل گیا، اس نے حکم دیا کہ شیخ سفر و حضر میں پابہ زنجیر اس کے ساتھ رہیں، پھر کئی برس کپڑے پہنانے کی خدمت لی، اس کے بعد دہلی سے آدھ گھنٹہ میں نکل جانے کا حکم دیا، اور عاملوں کو لکھ بھیجا کہ شیخ محمود حدودِ دہلی میں نہ آنے پائیں۔ چنانچہ جب تک وہ زندہ رہا آپ بن باسی رہے۔

فرشتہ نے لکھا ہے۔

"از قضا دراں مدت پادشاہ را قضایائے عجیبہ پیش آمدہ درہماں زودی فوت شدہ بندگانِ خدا خلاصی یافتند"

(جلد دوم صفحہ ۷۵)

لیکن تغلق کی کشتی کنارے آلگی تھی اور شیخ کا دہلی سے باحال پریشان نکلنا، دراصل کامیابیوں کے ساتھ واپس آنا تھا (اخبار الاولیا بضمن تذکرہ مولانا نور ترک) نارنول پہونچتے پہونچتے تختِ حکومت تغلق سے فیروز شاہ کو منتقل ہوگیا۔ فیروز شاہ آپ کا بہت معتقد تھا۔ اس نے اسی وقت قاصد بھیجکر آپ کو بلایا اور بہت خاطر تواضع کی (سیر السالکین)

بعض تذکروں میں لکھا ہے کہ آپ نے قبول خدمت سے انکار کر دیا تھا، اور انتہائی مصیبتیں بھگتنے پر بھی خدمت کے لئے تیار نہ ہوئے تھے، یہاں تک کہ فیروز شاہ کا زمانہ آیا اور اس نے رہائی دی۔ لیکن یہ واقعات غلط ہیں، اس روایت کی حامی صرف دو کتابیں ہیں ایک اخبار الاولیا، دوسری سلسلہ نظامیہ۔ فرشتہ مذبذب ہے اس نے دونوں روایتیں لکھ دی ہیں۔ اس کے مقابلہ میں واقعات مذکورہ کے ماخذ چھ سے زیادہ ہیں اور سب یک زبان ہیں کہ "ہمہ را تحمل کرد و دم نہ کشید"

سیرت المحمود میں لکھا ہے کہ تسلیم و رضا کا جذبہ اخیر عمر میں بہت بڑھ گیا تھا جس کی سب سے بڑی نظیر واقعۂ وفات ہے۔ اس زمانہ میں زیادہ وقت ذکر و شغل اور تلاوت قرآن میں صرف ہوتا تھا، ملنا جلنا، آنا جانا پڑھنا پڑھانا قطعاً بند ہوگیا تھا، عصر کے بعد سے صبح تک کسی سے نہیں ملتے تھے اور حجرہ میں دروازہ بند کرکے اپنے خاص کاموں میں مشغول رہتے تھے۔

ایک روز ایک قلندر آیا، خادموں نے اس کو کچھ دے دلا کر رخصت کرنا چاہا، مگر وہ قلندر کی صورت میں ملک الموت تھا سب کچھ لے کر بھی نہ ٹلا، اور اپنا سوال بڑھاتا رہا، آخر میں بولا: میرا سوال ایک گھوڑا ہزار دینار، دو زربفت کے تھان اور شیخ سے ملنا ہے۔ جب تک یہ سوال پورا نہ ہوگا نہیں جاؤں گا" خادموں نے شیخ سے اجازت لیکر اس کو اندر بھیجدیا، اب کیا تھا اس کو من مانی مراد مل گئی، اس نے حجرہ میں قدم رکھتے ہی دروازہ بند کرکے بغیر کچھ کہے سنے خنجر سے ایسے زخم لگائے کہ سارا جسم لہولہان ہوگیا، رگیں کٹ گئیں۔ خون کے فوارے چھوٹنے لگے اور شیخ تڑپ تڑپ کر بیہوش ہوگئے۔ مگر اس ظالم نے اس پر بھی بس نہ کی لاتوں سے خوب روندا، داڑھی نوچ ڈالی، انگلیاں توڑ دیں، ناخن جدا کر دیئے اور پوری طرح اپنا اطمینان کر کے (کہ دم نکل گیا ہے) دروازہ کھول کر بھاگا۔ خادموں نے خون آلود کپڑے دیکھکر پکڑ لیا، شیخ کو آکر دیکھا تو حالت بہت ہی زار و نزار تھی۔ مولانا صدر الدین حکیم کو

اطلاع دی وہ شہر کے تمام طبیبوں کو لیکر اسی وقت آئے، فیروز شاہ بھی یہ ماجرا سنکر آیا، قلندر حراست میں لے لیا گیا، چوتھے دن بڑی مشکل سے ہوش آیا۔ تمام عقیدت کیش حاضر تھے، فیروز شاہ بھی موجود تھا، قلندر پیش کیا گیا، آپ اس کو پا بزنجیر دیکھکر آبدیدہ ہوگئے، بولے اس کو چھوڑ دو، یہ بے قصور ہے۔" اس کے بعد اس سے فرمایا "میں بہت شرمندہ ہوں کہ میری وجہ سے تم کو اسقدر تکلیف پہونچی، امید ہے کہ تم معاف کردوگے۔" پھر فیروز شاہ سے کہا کہ اس کا سوال پورا کردو، مجھپر احسان ہوگا (یہ واقعہ قریب قریب تمام تذکروں میں ہے مگر یہ تفصیل صرف سیرت المحمود اور اخبار الاولیا میں ہے)

دم آخر تھا لوگوں نے قبر کی نسبت پوچھا، فرمایا "اُسی حجرہ میں بنے گی، پختہ نہ کرنا" تبرکات ساتھ جائیں گے، خرقہ سینے پر، کاسہ سرہانے تسبیح ہاتھ میں اور عصا پہلو میں رکھنا (اقتباس الانوار) فرشتہ کا بیان ہے کہ سید گیسو دراز کو توقع تھی کہ یہ چیزیں انھیں انعام ہونگی، لیکن یہ وصیت سنکر بہت رنجیدہ ہوے، اور اس رنج میں دہلی سے نکل کر دکن چلے آئے (جلد دوم صفحہ ۷۵)

شہر میں وفات کی خبر پہونچتے ہی کہرام مچ گیا، نماز جنازہ میں دہلی کے چھوٹے بڑے سب شریک تھے کئی جماعتیں ہوئیں۔ کہتے ہیں کہ اس روز در و دیوار پر ماتم کی سی تاریکی چھا گئی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا دہلی بے چراغ ہوگئی ہے (سیرت المحمود) اس درد و غم میں اکثر شعرا نے نوحے اور مرثیے لکھے۔ ان صفحات میں گنجائش نہیں ہے کہ ان کے منتخب اشعار بھی لکھے جائیں، شیخ کو مولانا مظہر سے خاص انس تھا، اس لئے یہاں ان ہی کے نوحے کے چند شعر لکھے جاتے ہیں (اخبار الاخبار)

زد و رمحنت ایں نہ سپہر زنگاری ۔۔۔ کدام دل کہ نہ خوں گشت از جگر خواری
کجا بہ جام طرب مجلسے بنا کردند ۔۔۔ کہ از سپہر نبارید سنگ قہاری
وفا ز عالم فانی مجو کہ مشہور اند ۔۔۔ فلک بخیرہ کشی اختران بغداری
خزینہ ایست سپہر از نفوس انسانی ۔۔۔ دفینہ ایست زمیں از تبان فرخاری
تو اے عزیز کہ در ملک و مال مغروری ۔۔۔ مباش ایمن اگر عاقلی و ہشیاری
چہ دانی آنکہ در اوراق کارخانۂ غیب ۔۔۔ قضا چہ نقش برآورد ز کلک جباری
زمانہ صلح کند بادل تو با خصمے ۔۔۔ فلک بدشمنی آید بہ پیش با یاری
چو وقت آں برسد ہیچ کس نگیرد دست ۔۔۔ نہ ملک بے ملکی نے سپاہ سالاری
بقا بقاے خدا ایست ملک ملک خداے ۔۔۔ کہ نیست قائم و دائم کسے بجز باری
ز دست چرخ ندانم کجا کنم فریاد ۔۔۔ کہ برگزشت بما جور او بسیاری
جہاں بماتم خواجہ نصیر دیں محمودؒ ۔۔۔ ہزار گونہ فغاں کرد نوحہ و زاری
بقیۂ سلف و یادگار اہل کرم ۔۔۔ کہ کرد ختم خلافت بملک دیں داری
مہیمنا ملکا منعما خدا وندا ۔۔۔ بحق نعمت قرآن و دولت قاری

برحمت تو کہ عام ست در جہاں باقی　　بعزت تو کہ خاص ست در جہانداری
کہ اے روح اعظم آں شیخ پیشواے کرام　　کہ مقتداے جہاں بود دہ دست زاخباری
ندیم قربت خود کن غریق رحمت خویش　　مجاور رسل و انبیاء مختاری
بساط صحن دہ از حلہ ہاے فردوسی　　غلاف خیر کن از پردہ ہاے غفاری

صفحات بالا میں آپ شیخ کے حسن سیرت کے خد و خال دیکھ چکے ہیں، اب آئیے ایک نظر صحبتوں کے حسن بیان پر ڈال لیں۔ قاضی عبد المقتدر رح نے مناقب الصدیقین میں اور حمید قلندر رح نے خیر المجالس میں آپ کے ملفوظات جمع کئے ہیں، سطور ذیل میں چند جواہر ریزے پیش کیے جاتے ہیں:۔

چند طالب علم اجزاے سلوک پر بحث کر رہے تھے۔ کوئی علم کا طرفدار تھا کہ یہی سلوک کی انتہائی بلندیوں تک پہونچا سکتا ہے۔ کوئی عمل کا حامی تھا کہ بغیر عمل علم بے سود ہے، اور کوئی صرف نیت ہی کو لیتا تھا کہ نیت کے صدق و خلوص پر ہر کام کے فتح یاب کا انحصار ہے۔ آپ نے انکی یہ بحث سنکر فرمایا: تم سب اپنے اپنے خیال میں سچے ہو، افراط و تفریط اٹھا دو تو تمھارے خیالات ایک ہی زنجیر کی کڑیاں بن جائیں گے۔ مراتب سلوک میں پہلا درجہ علم کا ہے، دوسرا عمل کا، تیسرا نیت کا۔ علم کے بغیر عمل درست نہیں ہوتا، عمل کے بغیر نیت کا وجود نہیں، اور نیت صالح نہیں تو علم و عمل دونوں بیکار ہیں۔ سالک کے لئے یہ تینوں غذا، پانی اور ہوا کی طرح ضروری ہیں۔

فرمایا مبتدی کے لئے اولین کام دل کی نگرانی ہے، اسکو چاہیئے کہ ہر وقت دل پر نظر رکھے اور خدا کی طرف متوجہ کرکے اسی میں مشغول کر دینے کی کوشش کرے۔

فرمایا: لوگ کرامت پر مرتے ہیں، حالانکہ سالک کے لئے یہ چیز موت ہے۔ ایمان کی فکر کچھ کم نہیں ہے کہ اور باتوں کی طرف توجہ ہو حیران ہوں کہ خلق بغیر مشاہدہ کیسے جیتی ہے۔

فرمایا: شریعت میں کمال حاصل کئے بغیر طریقت میں آنا بیحد خطرناک ہے۔ جو لوگ ایسا کرتے ہیں وہ زہر کا پیالہ پیتے ہیں۔ استقامت شرع کی صورت میں طریقت سے گر کر شریعت میں رہ سکتے ہیں، لیکن عدم استقامت کی صورت میں طریقت سے گر کر کہاں جائینگے جن کا ظاہر پاک نہ ہو اُن کا باطن بھی پاک نہیں ہو سکتا۔

کسی نے پوچھا درویشوں پر جو حال طاری ہوتا ہے اسکی کیا وجہ ہے؟
فرمایا: حال صحت اعمال کا نتیجہ ہے۔ اعمال کی دو قسمیں ہیں، ایک عمل جوارح دوسرا عمل قلب۔ عمل جوارح عبادات و مجاہدات ہیں، اور عمل قلب مراقبہ والمراقبۃ ان تلازم قلبک العلم بان اللہ ناظر الیک ان دونوں عملوں سے روح پر انوار نازل ہوتے ہیں ان کا اثر قلب پڑتا ہے، قلب سے جوارح متاثر ہوتے ہیں۔ پھر اُسی نے کہا کہ صاحب عوارف نے اہل حال کو متوسط کہا ہے، المبتدی صاحب وقت والمتوسط صاحب حال، والمنتہی صاحب انفاس" حاضرین کو یہ سنکر بہت تشویش ہوئی، فرمایا: گھبراؤ نہیں، بات بالکل صاف ہے۔ مبتدی کا سب سے پہلا کام اوقات کی نگرانی اور ہر لمحہ کو غنیمت جان کر کام میں لگانا ہے۔ جو شخص ایسا کرتا ہے وہ صاحب وقت ہے۔ چونکہ مواہب کا سبب کا

نتیجہ ہوتے ہیں، اور مکاسب میں یکسانی نہیں ہوتی، ہمیشہ گھٹتا بڑھتا رہتا ہے، اس لئے عالم علوی سے روح پر جن انوار کا نزول ہوتا ہے۔ وہ دوامی نہیں ہوتے بلکہ بجلی کی طرح چمکتے اور غائب ہو جاتے ہیں۔ لہذا ایسا شخص جو اس درجہ میں ہو متوسط ہے۔ لیکن جب اس کیفیت میں قیام و دوام ہو جاتا ہے تو اضطراری احوال استمراری ہو کر انفاس سے مل جاتے ہیں، اور کوئی سانس بغیر احوال کے نہیں گزرتا۔ جو شخص اس درجہ میں پہونچ جاتا ہے وہ سلوک کی منزل اول کا منتہی ہوتا ہے۔

ایک شخص نے دریافت کیا کہ انسان مرنے کے بعد اپنی اصل کی طرف راجع ہوتا ہے یا نہیں؟

فرمایا: راجع وہی ہوتا ہے جو زندگی میں اپنے مرجع کو پہچان لیتا ہے، اور موانع و علائق کو قطع کرکے اپنے تئیں اسمیں فنا کر دیتا ہے۔ لیکن جس کا جینا ایسا نہیں ہوتا، وہ مرنے کے بعد انہیں چیزوں کی طرف رجوع ہوتا ہے جن کے اندر زندگی میں منہمک تھا۔

فرمایا: سلوک میں اصل چیز نفس کی محافظت ہے، صوفی کو مراقبہ میں نفس پر نگاہ رکھنی چاہیے، اس کا ہر سانس دیکھا اور گنا ہوا ہو تاکہ خاطر جمع رہے۔ نفس سے توجہ ہٹتے ہی خاطر پریشان ہو جاتی ہے، بعض مشائخ نے المنتہی صاحب نفس کے یہی معنی لئے ہیں، اور ہندوؤں میں سادہو ایسا ہی کرتے ہیں۔

کسی نے پوچھا: ظاہری اور باطنی طہارت میں کیا فرق ہے؟ بولے: ظاہری طہارت وضو سے قائم ہوتی اور حدث سے ٹوٹ جاتی ہے۔ لیکن باطنی طہارت اس کی بھی متحمل نہیں ہوتی۔ محدثات میں پہلی چیز دنیا ہے، اس کا خیال گزرتے ہی سالک پر غسل طریقت فرض ہو جاتا ہے۔

فرمایا: اے عزیز میں نہ خلوت رکھتا ہوں نہ مشغولی، سارا دن لوگوں سے ملنے جلنے میں گزر جاتا ہے۔ لیکن تمھارے پاس فرصتیں ہیں، خلوتیں و تنہائیاں ہیں، انھیں ضائع نہ کرو، جو دم بھی گزر جائے غنیمت جانو، ایسا وقت پھر نصیب نہ ہوگا۔ کوشش کرو کہ نفس پر قابو ہو جائے، اور ہر جگہ اور ہر حال میں وہ اپنے کام میں مشغول رہے۔

پوچھا گیا راہ کیا ہے اور منزل کونسی؟ فرمایا: کس راہ و منزل سے سوال کرتے ہو؟ ارباب شریعت کی راہ و منزل سے یا اصحاب طریقت کی؟ عرض کیا۔ دونوں سے۔ کہا: ارباب شریعت کی راہ و منزل نفس و مال سے اٹھ جاتا ہے: ان اللہ اشتری من المومنین انفسھم و اموالھم اور اصحاب طریقت کی راہ و منزل جان و دل سے اٹھ جانا اور وحدت میں رہنا ہے۔ و تبتل الیہ تبتیلا۔ و ان الی ربک المنتھی۔ دوستو! تم مسافر ہو، مسافروں کی طرح رہو۔ مسافروں کو اقامت کی نیت درست نہیں ہوتی، پھر تم نے راستہ میں کیوں پڑاؤ کر لیا؟ اٹھو چلنے سے ایمان تازہ ہوتا ہے، بیٹھ رہنا گناہ ہے۔ تم خواہ شریعت میں ہو خواہ طریقت میں۔ ہر حال میں مسافر ہو۔ تمھارے سفر کی منزل مقصود مالک الملک کا مشاہدہ ہے۔ عرض کیا: مالک الملک کہاں ہے کہ روئے دل اسکی طرف پھیریں؟ فرمایا کونسی جگہ ہے جہاں وہ نہیں ہے؟ اینما تولوا فثم وجہ اللہ۔ یہ نہ خیال کرو کہ وہ تم سے دور ہے، اور ہم اس کو کہاں ڈھونڈیں۔ ذرا اپنے محبوبات و مالوفات سے نکل کر تو دیکھو ؎

تا دیدہ بود دیدہ کجا آید دوست ـــــ خواہی کہ شود دیدہ بروں آئی زپوست

از دیدہ و دید نی چو تو بگذشتی　　　دانی کہ کسے نیست بہ بینی ہمہ اوست

فرمایا: سلوک میں آستیں کوتاہ کردی جاتی ہے' اور سر کے بال تراش دیئے جاتے ہیں۔ مگر جانتے ہو اس کا کیا مطلب ہے؟ دنیا سے دست کشی اور راہ حق میں سربازی سلوک کی منزل اول ہے۔ آستین چھوٹی کرنا اور بال تراشنا۔ سالک کو اسی طرف ہدایت کرتا ہے۔ مگر افسوس کہ اہل طریقت جانتے بوجھتے ان باتوں سے روگرداں ہو گئے ہیں' اور سلوک کی ان معمولی معمولی باتوں کی بھی پابندی نہیں کرتے' تا بدیگراں چہ رسد

کسی نے کہا: مشائخ نماز کے بعد مصافحہ کیوں کرتے ہیں۔؟ فرمایا: مسافر باہر سے آ کر مصافحہ کرتے ہیں۔ مشائخ بھی نماز سے خارغ ہوتے ہیں تو باہر سے آتے ہیں۔ ان کی نماز روحانی سفر ہوتی ہے' وہ اسوقت اپنے آپے میں نہیں ہوتے۔

فرمایا۔ طلب و جوع ہر کامیابی کے لئے ضروری ہے' وہ طلب ناقص ہے جس کے لئے قربانیاں نہ کی گئی ہوں۔ جو مقصد جتنا اعلیٰ ہوتا ہے اس کے لئے اتنی ہی زیادہ قربانیاں کرنی پڑتی ہیں۔ خدا کی محبت تکمیل انسانیت کا آخری مقصد ہے۔ سالک کو اپنے اندر صدق طلب اور حصول مقصد کے لئے جان توڑ کوشش کرنی چاہئے۔ مشائخ نے ابتدا میں روزہ اسی لئے قرار دیا ہے' تاکہ جس مقصد سے محبوبات و مالوفات کو ترک کیا گیا ہے۔ اسکی یاد ہر دم تازہ رہے' مادیت کم ہو' روح میں تازگی آئے۔ دنیا کی طرف سے دل ہٹے' اور ولولۂ طلب دمبدم بڑھتا رہے۔ جو لوگ اس حصار میں داخل ہو جاتے ہیں' نفس اور شیطان کی آمد و شد سے محفوظ ہو جاتے ہیں' اور اُن کے خطرات رحمانی ہوتے ہیں۔ میں ہر مبتدی کو جوع بے صوم کی (جو قوی ہو) اور جوع باصوم کی (جو کمزور ہو) ہدایت کرتا ہوں۔

پوچھا: جاھدوا فینا کے کیا معنی ہیں؟ فرمایا: اہل ادب کلمہ فی کی اتصالیت پر زور دیتے ہیں' اور ظرف و مظروف کی بحث چھیڑتے ہیں۔ لیکن مشائخ کے ہاں کچھ اور معنی ہیں۔ وہ کہتے ہیں مجاہد کی تین قسمیں ہیں۔ ایک دوزخ سے ڈرنے والے' دوسرے بہشت کے امیدوار تیسرے خدا کے طالب۔ جنت و دوزخ کی امید و بیم مجاہدہ مجاہدہ للہ ہے' اور طلب مولیٰ کا مجاہدہ مجاہدہ فی اللہ ہے۔ اول الذکر مجاہدے معمولی اور آسان ہوتے ہیں۔ لیکن آخر الذکر مجاہدہ نہایت سخت اور مشکل ہوتا ہے' اسی کی نسبت ہے جاھدوا فی اللہ حق جہادہ مطلوب جتنا بلند ہوتا ہے۔ اتنی ہی زیادہ اس کے لئے محنت کی جاتی ہے۔

فرمایا: اعمال کی قبولیت جذبہ پر موقوف ہے' جو کام جذبہ سے نہ ہوگا قبول نہیں کیا جائیگا۔ جذبہ کے لئے کوئی وقت معین نہیں ہے' کبھی بچپن میں پیدا ہوتا ہے' کبھی جوانی میں' کبھی بڑھاپے میں۔ لیکن اس کے مراتب ہیں' عوام کا جذبہ اعمال میں توفیق پاتا ہے اور خواص کا جذبۂ عشق خالق میں فنا ہو جاتا ہے۔

فرمایا: محبت کی دو قسمیں ہیں' ایک محبت ذات دوسرے محبت صفات۔ محبت ذات مواہب سے ہے' اور محبت صفات اکتسابی وہ ہماری دسترس سے باہر ہے' اور یہ بالکل ہمارے ہاتھ میں ہے ہمیں چاہئے کہ اس قدرت کو کام میں لائیں' اور ایک دم کے لئے بھی اپنے اس اختیار اور فرض سے غافل نہ ہوں' ہمارا کام بالکل صاف اور واضح ہے' ہمیں فانی زندگی' اور ماسوی کے الجھاؤ سے نکل کر عشق الٰہی سے سرشاری لینی ہے ہمیں اسکو لینے کی جدوجہد کرنی چاہئے۔ اس کے چار رکن ہیں: عزلت' قناعت' توبہ' فنا دگی۔ جو لوگ ان کی حقیقت کو پا لیتے ہیں وہ تمام خطرات و مہالک سے محفوظ ہو جاتے ہیں' ان کے آگے روحانی ترقیوں کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ اور وہ ابدی

زندگی حاصل کرلیتے ہیں۔

فرمایا: جب تک راہ نہ چلیں منزل کو نہیں پہونچ سکتے' جہدو کوشش ضروری ہے: والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا مجاہدہ بھی راہ روی ہے' اس سے روح آمدنشوں سے پاک اور مادی گرفتاریوں سے آزاد ہوجاتی ہے۔ جس مقصد سے جو کام کیا جاتا ہے اور جتنے جوش و سرگرمی سے کیا جاتا ہے وہ آخر عروس کامیابی کی صورت دیکھتا ہے۔

فرمایا: سالک کو اپنے کام میں سپاہی کی طرح مضبوط' مستعد' اور بلند ہمت ہونا چاہیے۔ زمانہ کے گرم و سرد کے طوفان اٹھیں اور گزر جائیں' راحتوں اور خوش حالیوں کی حکومتیں قائم ہوں اور چٹ ہوجائیں۔ لیکن اس کا دل اس جلوہ سراب سے میلانہ ہو وہ اپنی جگہ سے سرو جنبش نہ کرے' اس کا ارادہ لوح محفوظ کی طرح اٹل رہے' اس کی نظر دم بھر کو نہ چوکے۔

انسان لسیر الحصول کامیابیوں کی قدر نہیں کرتا' اس لئے کوئی کامیابی سامنے نہیں آجاتی۔ آرام کا خوگر ہونے کے لئے تعب کا مزہ چکھنا ضروری ہے۔ حضرت موسیٰ کو نبوت کی منزل تک پہونچنے کے لئے بیشمار مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ تنور میں ڈالے گئے تابوت میں رکھے گئے۔ دشمن کے ہاتھ گرفتار ہوئے۔ قبطی کی موت کا واقعہ پیش آیا' چودہ برس غریب الوطنی کی مصیبت اٹھائی' اور ایک دم کو آرام نہ پایا۔ تاہم وہ دل تنگ نہ ہوئے ہر منزل فاتحانہ اولوالعزمی سے طے کی۔ ایک رات زمین سے آسمان تک اندھیرا چھا رہا تھا' بجلی چمک چمک کر غائب ہوجاتی' اور کڑک سے ساری مخلوق کپکپا جاتی تھی' بادلوں کی گرج سے کوہ و صحرا دہلے ہوئے تھے' مینہ کہتا تھا اب برس کے پھر نہ برسوں گا' سردی ایسی شدید تھی کہ معلوم ہوتا تھا برف کٹ رہی ہے' جنگل کے وحشی جانور اپنے بھٹوں سے نکل پڑے تھے۔ اور موسیٰ اپنی بی بی کو لئے لق و دق جنگل میں بھٹک رہے تھے۔ اسی حال میں ان کو درد زہ اٹھا' اور آناً فاناً اتنا بڑھ گیا کہ وہ ضبط نہ کرسکیں۔ موسیٰ نے کونے کھدروں میں آگ ڈھونڈی' مگر اس موسلا دھار مینہ میں وہ کہاں مل سکتی تھی' چقماق کی آگ بھی سردی اور پانی سے بجھ گئی تھی۔ مجبور و مایوس ہوکر بیٹھ گئے۔ لیکن مصیبتوں کی یہ آخری منزل تھی۔ خدا نے اسی کف دست جنگل کو کامرانیوں کا باغ سدا بہار بنا دیا۔ قریب کی پہاڑی پر آگ کا شعلہ چمک کر بولا: انی انت۔ نادا' موسیٰ بے تابانہ دوڑے مگر وہاں پہونچے تو اور ہی گل کھلا آواز آئی انا ربک فاخلع نعلیک انک بالواد المقدس طویٰ۔ پس بیکر دوستو! راہ مقصود میں مصیبتیں برداشت کرنے کیلئے تمہیں بھی ایسا ہی قوی دل' بلند ہمت' اور جوان عزم ہونا چاہیے۔

در رہ منزل جاناں کہ خطرہاست بسے
شرط اول قدم است کہ مجنوں باشی

فرمایا: موجودات محسوس کو اصطلاح تصوف میں عالم ملک کہتے معقول کو عالم ملکوت' بالقوہ کو عالم جبروت۔ اور اس کے ماوراء کو عالم لاہوت کہتے ہیں۔ ان میں سے ہر عالم دوسرے عالم پر محیط ہے اور یہ احاطہ لطافت کی وجہ سے ہے۔ ملک کے مقابلہ میں ملکوت کے اور ملکوت کے مقابلہ میں جبروت کے لطائف بہت لطیف ہوتے ہیں۔ مگر لاہوت کے لطائف لطیف تر ہوتے ہیں اسی وجہ سے لاہوت' ملک و ملکوت اور جبروت کے ذرہ ذرہ پر محیط ہے۔ اور اسکی ساری حقیقتیں آئینہ کے مانند اس پر منعکس ہوتی ہیں جو لوگ اس مقام میں پہونچ جاتے ہیں' زمان و مکان کی قید سے آزاد ہوجاتے ہیں' ان کے لئے قریب و بعید سب یکساں ہوجاتا ہے۔

ظاہر و باطن سب پر ان کی نگاہ ہوتی ہے یہی مقام ہے جہاں وھو معکم اینما کنتم، اور نحن اقرب الیہ من حبل الورید راست آتا ہے۔

فرمایا عشق کا کمال یہ ہے کہ عاشق کے لئے منع و عطا، رد و قبول، رحمت و لعنت ایک ہو جائے، جب تک فرق کا احساس باقی ہے عشق ناقص ہے۔ کمال وہاں ہے جہاں فرق نہیں ہے۔ جو عشق اس درجہ کو پہونچ جاتا ہے وہ سچا عشق ہے، اس کے لئے لعنت بھی رحمت اور ہجر بھی وصال ہے

فرمایا: صفات بشریت حقائق کے منافی ہیں جب تک بشریت کے صفات باقی ہوں سالک مقام حقائق تک نہیں پہونچ سکتا۔ اسی لئے کہا ہے تخلقوا باخلاق اللہ۔

فرمایا: جس کا دل قوی، امید صادق، ہمت بلند ہو اس کا باطن اس تجلی کے ظہور سے چمک اٹھیگا جس کے ادراک سے عقول ملکی و بشری عاجز ہیں۔ سلوک اسی وقت پختہ ہوتا ہے جب کوئی آرزو باقی نہیں رہتی اور ہمت دنیا و آخرت سے گزر جاتی ہے میرے عزیزو! تم کو اتنا بے نیاز اور سیر چشم ہونا چاہیئے کہ دونوں جہان کی نعمتیں بھی تمھارے قدموں پر ڈالدی جائیں تو تمھارا دل ان کی طرف مائل نہ ہو۔ تمھارا مطمح نظر حال یہ ہونا چاہیئے کہ ؎

دنیاست بلاخانہ و عقبیٰ ہوس آباد ما حاصل ازیں ہر دو بیکبار جو نستانم

فرمایا: خمخانۂ رحمت سے جو کچھ پلایا جائے، قدح قدح پیو اور بدمستی نہ کرو۔ یہاں کام صرف ہمت پر ہے جتنی ہمت بلند ہو گی تلب اور تشنگی اتنی ہی زیادہ ہو گی۔

ہر کہ صاحب ہمت آمد مرد شد ہم چو خورشید از بلندی فرد شد

فرمایا: توحید ایک دریا ہے جسمیں علم و عقل، دانش و بینش، محسوسات و مدرکات سب غرق ہیں جو اس دریا میں ڈوب جاتے ہیں ان پر مدام حیرت طاری رہتی ہے۔

قطرہ کو غرق در دریا بود ہر دو کونش جز خدا سودا بود

اس حیرت زدگی میں کسی سے کچھ رہ جائے تو اس کے لئے وہ معذور ہے اسکی بزرگی کی وجہ سے اس کا کوئی قول و فعل دوسروں کے واسطے حجت نہیں ہے۔

فرمایا: امام شبلی سے کسی نے پوچھا: ماصفۃ العارف؟ بولے: صم بکم عمی۔ پس ہمیں یہ شور و غوغا کیا فائدہ دے سکتا ہے افسوس ہے کہ اب ہماری زبانیں چلتی ہیں اور عمل خاموش رہتے ہیں، پہلے عمل چلتے تھے اور زبانیں خاموش رہتی تھیں۔

دوستو! منھ بند کر لینا چاہیئے، لکھنا پڑھنا پردہ کے باہر ہے، پردہ کے اندر عمل اور خاموشی ہے ؎

چوں سر از لِ طعمہ ابدال شود آں جملہ قیل و قال پامال شود
ہم مفتی شرع را جگر خوں گردد ہم خواجۂ عقل را زباں لال شود

فرمایا: ہمارے ہاں پسندیدہ روش الاستقامۃ علی الشریعۃ مع کتمان السر ہے

فرمایا: صوفی خدا کا طالب ہوتا ہے، اسے لباس کی قیود سے آزاد ہونا چاہیئے۔ خرقہ، عمامہ، پیراہن، کفنی محض عادت پرستی ہے۔ اخلاق

اچھے نہ ہوں تو روزہ نماز کچھ فائدہ نہیں دے سکتا۔ یہ ظاہری اسلام اور باطنی بت پرستی ہے۔ صوفی کا کام اخلاق انسانی سے گزر جاتا ہے خدا لباسوں کو نہیں دیکھتا، اسکی نظر ہمیشہ اخلاق پر رہتی ہے، وہ دلوں اور نیتوں کو دیکھتا ہے: ان اللہ لا ینظر الی صورکم و اعمالکم ولکن ینظر الی قلوبکم و نیاتکم۔

فرمایا: سالک کو مرنج مرنجاں ہونا چاہئے۔ اس کے اقوال و افعال سے کسی کو صدمہ نہ پہونچے، دوستوں کے ساتھ لطف و محبت سے اور دشمنوں کے ساتھ خاطر مدارات سے پیش آئے۔ سچ کو کبھی ہاتھ سے نہ دے، اور خدا سے اپنا معاملہ بالکل راست رکھے۔ اسکی نظر وجودیات سے بلند رہے۔ اس کے بعد فکر کو فضائے ربوبیت میں پرواز کرنی چاہئے۔

فرمایا: سالک کو دشمن کی طرح اپنے اعمال کا محاسبہ کرنا چاہئے۔ اس کا کام یہ ہے کہ رات دن برائیوں کی گھات میں لگا رہے، اور جلاد کی طرح ایک ایک برائی کو چن چن کر ہلاک کردے۔ اسکو ہمیشہ ٹوہ رکھنی چاہئے کہ اعضائے ظاہری و باطنی میں کون کون پاک ہے اور کون کون پلید۔ جو پلید ہو جائیں انھیں توبہ اور تجدید ایمان سے پاک کرنا چاہئے اور کوشش کرنی چاہئے کہ پھر وہ ناپاک نہ ہونے پائے۔ جب اس پر پوری طرح قدرت حاصل ہو جائے گی تو حقیقت ایمانی جلوہ گر ہوگی، اور محاسن و محامد کا ظہور ہونے لگیگا۔

فرمایا: سالک کیلئے اکل حلال پہلی اور سب سے بڑی پاک دامنی ہے، جسکی روزی حلال اور عادتیں اچھی ہوں وہ جنید وقت ہے۔ جس کو یہ سعادت نصیب ہو جائے اسکو خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے۔

حضرت محمود کی خوبیوں اور رعنائیوں کی داستان ابھی بہت طویل ہے، ان کے ملفوظات (عربی اور فارسی میں) اتنے زیادہ ہیں کہ خواجگان چشت میں اتنے کسی کے نہ ہوں گے۔

ناظر دہلوی

تذکرہ خندہ گل

یعنی

ظریف شاعروں کا تذکرہ

نہایت تیزی کے ساتھ چھپ رہا اور یقین ہے کہ جلد مکمل ہو جائیگا۔ جن حضرات نے دام پیشگی بھیجدئے ہیں، انکی خدمت میں طباعت کے بعد بذریعہ رجسٹری فوراً روانہ کر دیا جائے گا۔

اب بھی موقعہ ہے کہ آپ دو روپیہ بھیجکر نصف قیمت میں اسے حاصل کرلیں، ورنہ طباعت ختم ہونے پر چار روپیہ سے کم اسکی قیمت نہ لیجائے گی، اور محصول علاوہ اس کے ہوگا، کیونکہ اسکا حجم ۵۰۰ صفحات سے زیادہ ہوگا۔

اردو زبان میں یہ پہلا تذکرہ ہے جسمیں تمام قدیم و جدید ظریف شاعروں کے حالات، انکے لطائف اور انتخاب کلام کو یکجا کردیا گیا ہے۔

منیجر "نگار" لکھنؤ

فضل حسین صاحب تبسم کے مضمون حالاتِ عرفی پر ایک نظر کی تنقید

اور
مُلا عبد النبی مرحوم کے تذکرہ "میخانہ" پر ایک ضمنی تبصرہ

اسوقت جناب فضل حسین صاحب تبسم کا تنقیدی مضمون، جو "حالات عرفی پر ایک نظر" کے عنوان سے فروری ۲۹ء کے نگار میں چھپا ہے، میرے پیش نظر ہے اور چونکہ اس میں میرے مضمون "عرفی" پر تنقید کی گئی ہے اس لئے مجھے حق حاصل ہے کہ براہ راست انہیں سے مخاطب ہو کر جواب عرض کروں۔

میرے محترم دوست! قبل اسکے کہ میں آپکی تنقیدی تحریر پر روشنی ڈالوں یہ ضروری ہے کہ چند الفاظ میں آپکا شکریہ ادا کروں، کہ آپنے میری ناچیز تحریر کو کم از کم اہمیت کی نظر سے تو دیکھا، لیکن معاف فرمایئے اگر اسی کے ساتھ یہ بھی عرض کروں کہ "سخن شناس نہ دلبرا سخن اینجاست"۔

جیسا کہ آپ نے خود تحریر فرمایا ہے، آپکی تنقید محض صاحب "میخانہ" کی تحقیقات پر مبنی ہے، جسکی تصنیف کا زمانہ ۱۰۲۶ھ ہے یعنے عرفی کی وفات کے ۲۹ سال بعد یہ کتاب لکھی گئی، آپ نے اسے بھی بڑی اہمیت دی ہے کہ مصنف عرفی شیرازی کے خالو سے ملا تھا، میری تحقیقات کا دارومدار اورینٹل لائبریری (پٹنہ) کی متعدد قلمی کتابیں تھیں جنمیں ایک مآثر رحیمی مصنفہ عبد الباقی نہاوندی کا قلمی نسخہ بھی تھا، اپنی بدقسمتی کا شکوہ کروں یا آپ کی نظر عنایت کا شکریہ، کہ جو تنقید بھی (باستثنائے ایک واقعہ) آپ نے کی وہ ان واقعات سے متعلق ہے جنھیں میں نے صاحب مآثر رحیمی کے حوالہ سے لکھا تھا، کیا آپکو خبر نہیں کہ مآثر رحیمی کب لکھی گئی، اور اسکا مصنف عرفی کے زمانہ سے صاحب میخانہ کی بہ نسبت قریب تھا یا بعید؟ اگر آپ کو مآثر رحیمی کا زمانۂ تصنیف معلوم ہوتا، اور پھر یہ حقیقت بھی آپ پر واضح رہتی کہ مآثر رحیمی کی روایتیں صاحب میخانہ کی بہ نسبت زیادہ قابل وثوق اور مرجح ہیں تو غالباً آپ تکلیف کرنے کی جرأت نہ کرتے، کیا ترمذی شریف کے اندر آپنے صحیح اور ضعیف، موصول اور مقطوع، حسن اور مرفوع کے مدارج و تقسیم کے واقعات نہیں دیکھے؟ صاحب میخانہ کی روایات موصول ہیں یا مقطوع؟ آپنے خود ہی اعتراف کیا کہ صاحب میخانہ عرفی سے نہیں ملا، بلکہ اسکی وفات کے بعد صرف اسکے خالو سے ملا، آپنے حدیث کے اقسام، رواۃ کے طبقات، اور اصول حدیث کا مطالعہ کیا ہوگا، تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ایسے راوی کی روایت جو نہ واقعہ کے وقت موجود ہو، اور نہ خود صاحب واقعہ سے ملا ہو، علمائے تاریخ و سیر کے نزدیک کہاں تک قابل اعتنا و استناد ہے؟

آپ نے بڑے جوش کے ساتھ یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ علامہ شبلیؒ نے ماخذ شعر العجم میں میخانہ کا تذکرہ کیا ہے، معلوم ہوتا ہے، شعر العجم کا

وہ حصہ آپ کی نظر سے نہیں گذرا، جو عرفی شیرازی کے متعلق ہے، عرفی کے متعلق علامہ مرحوم کی تحقیقات کا زیادہ حصہ مآثر رحیمی ہی پر مبنی ہے۔

یہاں تک تو آپ کی مایۂ ناز کتاب میخانہ کی حقیقت تاریخی کے متعلق تھا، اب اپنی تنقید کا بھی سلسلہ وار جواب سن لیجئے۔

نام و نسب یہ صحیح ہے کہ میں نے صاحب مآثر رحیمی کے حوالہ سے عرفی کا پورا نام خواجہ سید محمد بن زین الدین علی علوی بن جمال الدین مشہور بہ "چادر باف" لکھا تھا، آپ لکھتے ہیں کہ اسکا اصل نام محمد حسین تھا، اور اس کے والد کا نام "خواجہ بلوی" ہے! اصول روایت کے مطابق تو صاحب مآثر رحیمی ہی کا قول مرجح ہونا چاہئے، لیکن درایۃً بھی یہاں آپ پر چند اعتراضات ہوتے ہیں، "محمد" تک ہم آپ متفق ہیں باقی رہا "حسین" تو ممکن ہے گھر والوں نے محمد حسین ہی نام رکھا ہو لیکن دنیا نے اسے جس نام سے خطاب کیا وہ وہی ہے جو میں نے اپنی ناچیز تحقیق میں ظاہر کیا تھا، اور اس کی دلیل یہ ہے کہ تمام تذکرہ نویسوں نے یہی نام لکھا ہے، مآثر رحیمی، صحف ابراہیم، مخزن الغرائب، مجمع النفائس، ریاض الشعرا، میں یہی نام پائے جاتے ہیں، آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ ہزاروں اکابر اس نام سے مشہور نہیں ہیں، جو ان کے ماں باپ نے رکھے تھے، اگر کوئی شخص اپنی تحقیق کی بناپر متقدمین کے حوالہ سے یہی نام لکھے تو کیا آپ کو اسمیں تاریخی غلطی نظر آئے گی؟ یہ تو درایت کے لحاظ سے میں کہہ رہا ہوں، ورنہ روایت کے لحاظ سے تو مجھے صاف انکار کر دینا چاہیے کہ صاحب میخانہ کی تحقیق کو میں عبدالباقی نہاوندی کی تحقیق کے مقابلہ میں ماننے کیلئے تیار نہیں،

آپ نے اس کے والد کا بھی ایک نہایت ہی پر لطف نام پیش کیا ہے، آپ ہی فرمائیے عقل "زین الدین علی علوی" تسلیم کرنے کیلئے تیار ہے، یا خواجہ بلوی" نہ معلوم بلوی کس لغت کا لفظ ہے اگر صاحب میخانہ کی تحقیق آپ کے نزدیک زیادہ قابل اعتبار تھی، تو کم از کم آپ فارس کے جغرافیہ کا مطالعہ تو کر لیتے، یاقوت حموی کی کتاب معجم البلدان عربی میں موجود ہے، ناصر خسرو علوی کا سفرنامہ فارسی ہی میں نہیں بلکہ ایم۔ شیفر۔ کی بدولت فرنچ میں بھی پایا جاتا ہے، آپ کو جستجو کرنی تھی کہ آیا "بلو" فارس میں کوئی مقام بھی ہے یا نہیں اور اگر یہ بات آپ ثابت کردیں تو بھی آپ پر یہ اعتراض قائم رہے گا، کہ یہ نام اضافت بہ ادنی ملابست کے رشتہ سے ہے حقیقی نام کچھ اور ہے، اگر میں امام بخاری کو محمد بن اسمعیل، اور رازی کو فخر الدین، یا محمد بن زکریا لکھوں تو آپ اسے تاریخ کی روشنی میں غلط ثابت کرنیکی کوشش کریں گے، ہر سنجیدہ دماغ صاحب میخانہ کی تحقیق "خواجہ بلوی" کو ماننے کے لئے تیار نہیں، اگر آپکو اسپر اصرار ہے، تو آپ براہ کرم لفظ "بلوی" پر مزید روشنی ڈالئے۔

آپنے وجہ تخلص پر بھی اعتراض کیا ہے، آپ نے فردوسی کی ابتدائی زندگی کا مطالعہ کیا ہوگا، تو آپکو معلوم ہوگا کہ ابتدائً "فردوسی" اس کا تخلص نہ تھا اسی طرح مرزا نوشہ دہلوی کو دیکھئے، وہ پہلے "اسد" تخلص کرتے تھے، اب کوئی صرف فردوسی اور غالب لکھے اور ان کے ابتدائی تخلص کا تذکرہ نہ کرے تو کیا آپ کو اعتراض ہوگا، اگر عرفی ابتدا صیدی تخلص کرتے تھے، تو بعد میں انہوں نے میری تحقیق کے مطابق شرعی اور عرفی (سوشل) معاملات کی مناسبت سے عرفی تخلص اختیار کیا تو کونسا استبعاد عقلی ہے، یہ بھی میں نے صاحب مآثر رحیمی کے حوالہ سے لکھا تھا، یہ تو آپ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ اسکے والد حکومت میں ایک عہدہ پر فائز تھے

...صاحب مآثر رحیمی کے مفصلۂ ذیل قول کو صحیح مانا جائے تو اعتراض ہی کیا ہے؟ فرماتے ہیں:-

"سبب عرفی تخلص نمودن ایشان آنست کہ چوں پدرش بعض اوقات در دیوان حکام فارس با مر داروغہ
دار الافاضل شیراز مشغولی می نمود مناسبت شرعی و عرفی را منظور داشتہ تخلص خود عرفی کرد"

لطف تو یہ ہے کہ صاحب میخانہ کی روایت سے یہاں تضاد بھی واقع نہیں ہوتا، اور آپ اپنے جوش تنقید میں اسے متضاد ...خیال فرما رہے ہیں، صاحب میخانہ بھی اپنی جگہ پہ صحیح اور مآثر رحیمی کی روایت بھی معتبر اگر تھوڑی دیر کے لئے تسلیم کر لیا جائے، ...یا ابن شیراز ہی نے تخلص عرفی کا "انتخاب" کیا، تو میں نے یہ تو لکھا نہیں کہ عرفی نے "خود" انتخاب کیا، بلکہ صرف "اختیار ...یا" لکھا تھا۔

...لادت و وفات

برادرم یہ دیکھ کر میری حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہی کہ اس بادیہ پیمائی میں آپ جتنے قدم آگے بڑھاتے گئے ہیں، اسی قدر منزل دور ہوتی گئی ہے، آپ نے ملا عبد النبی مرحوم کا تاریخی حیثیت سے یہ غیر ذمہ دارانہ ...جملہ تو نقل کر دیا، لیکن اس کے تحقیقی نقایص و معایب پر غور فرمانیکی زحمت گوارا نہیں کی۔ ملا صاحب فرماتے ہیں:-

"ہنوز سنش بہ چہل نہ رسیدہ بود کہ در لاہور در سنہ اثنی و الف عالم فانی را وداع نمود" اور چند جملوں کے بعد مرزا نظام قزوینی کا یہ بیان نقل کرتے ہیں "چوں نزدیک او شدم، دیدم کہ کار بر دو شوار شدہ و نفسش بشمار افتادہ پرسیدم چہ حال داری جواب داد "دو ششش و شش پنج" اب آپ استنباط فرماتے ہیں کہ اس سے وقت مرگ کی رباعی کی تصدیق نہیں ہوتی۔

پہلے تو آپ کے ملا صاحب کے "طوفان تحقیق" ہی پر مجھے اعتراض ہے، یہ ایک مورخ کا نقص نہیں تو اور کیا ہے کہ وہ ...بجائے عمر کی صحیح تعین کردینے کے، صرف یہ غیر ذمہ دارانہ جملہ "ہنوز سنش بہ چہل نہ رسیدہ بود" لکھدے، صرف اسی واقعہ کو لے لیجئے، تو ملا ...صاحب کے معیار تاریخ دانی، اور ذوق کاوش پر کافی روشنی پڑتی ہے، اسکے برخلاف صاحب مآثر رحیمی کا قول دیکھئے۔

"بتاریخ شوال تسع و تسعین و تسعماۃ ٩٩٩ در سن سی و شش سالگی در لاہور جہان فانی را وداع نمود"

ارباب تمیز بیک نظر جان لے سکتے ہیں، کہ صاحب میخانہ کی روایت ترجیحی پہلو رکھتی ہے، یا صاحب مآثر رحیمی کی، "ابھی عمر کا چالیسواں ...سال بھی نہ گذرا تھا، کہ وفات پائی" قطعی فیصلہ ہے یا یہ کہ "٩٩٩ھ میں ٣٦ سال کی عمر میں دنیا سے گذر گئے" اسکول کی جب تاریخ یاد نہیں ...رہتی ہے، تو بچے استادوں کو ایسا ہی مغالطہ دیا کرتے ہیں، "ہنوز سنش بہ چہل نہ رسیدہ بود" نے میرے سامنے زندگی کا وہ دلچسپ ...واقعہ بعینہ پیش کر دیا۔

میں نے لکھا تھا کہ عرفی نے بستر مرگ پر ایک رباعی کہی تھی، اور آپ نے اسے ساقط الاعتبار تصور کیا، کیونکہ ملا عبد النبی نے یہ لکھا ہے، ...کہ دم نکل جانے کے کچھ وقت قبل جب میر نظام الدین قزوینی عرفی سے ملے، تو انہوں نے "دو ششش و شش پنج" کہا، اس استنباط ...سے تو پتہ چلتا ہے کہ آپ نے کبھی "اشکال بخاری" کا مطالعہ نہیں کیا، محدثین نے بخاری کی بعض روایتوں کو جو بظاہر متضاد معلوم

ہوتی ہیں، تطبیق دے کر نہایت باریک بینی کا ثبوت دیا ہے، میں آپ کو مشورہ دونگا کہ بخاری کی ایسی روایات ضرور مطالعہ کریں کیونکہ آپکی بحث تنقید کیلئے فایدہ بخش ہوگا۔

مختصراً سن لیجئے، محدثین نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت کی مختلف حدیثیں روایت کی ہیں، جن میں دو یہ ہیں ۱ خرجوا الیہود والنصاریٰ من جزیرۃ العرب دوسری حدیث (بخاری، کتاب الجنائز) میں حضرت عائشہ صدیقہؓ کی روایت سے یہ ہے، کہ آپ دم واپسین کے وقت اللھم الرفیق الاعلیٰ فرمارہے تھے، دونوں حدیثیں، اصول روایت کے مطابق صحیح ہیں، اب آپ کے اصول تنقید کو پیش نظر رکھا جائے تو دونوں متضاد ثابت ہونگی، حالانکہ علماء نے انکی تطبیق دی ہے، دونوں اپنی اپنی جگہ پر صحیح ہیں اگر عرفی نے سانس نکلتے وقت "دو شش و شش پنج" کہا تھا، تو اس سے بستر مرگ پر رباعی کہنے کی تردید کہاں سے ہوگئی، میں نے یہ تو لکھا ہی نہیں کہ "عرفی نے یہ رباعی کہی اور انکا دم نکل گیا" بلکہ صرف بستر مرگ کا لفظ ہے، یعنی جس بیماری سے انہوں نے قضا کی، اس بیماری مرگ میں یہ رباعی کہی تھی، آپ کو غالباً "دم نزع" کی ترکیب سے غلط فہمی ہوئی "دم نزع" سے "سانس اکھڑ جانا" مراد نہیں ہے، بلکہ "وقت آخر مراد" ہے کیونکہ جب سانس اکھڑ جاتی ہے تو ہوش کہاں رہتا ہے کہ انسان شاعری کرے۔

ورود و قیام ہند اس عنوان کے ماتحت بھی آپ نے نہایت پر لطف مباحث پیدا کئے ہیں۔ مثلاً یہ آپ نے عرفی کو معشوق ایران تصور کر کے ہندوستان میں اس کے ورود کو بھی محض "اضمحلال حسن" ہی کی وجہ سے قرار دیا، مجھے جس قدر آپسے شکوہ ہے اس سے کہیں زیادہ خود ملا عبد النبی صاحب کی ادائے ستمگار کا گلہ ہے، معلوم ہوتا ہے، وہ نہ تو اصول سیرت نگاری سے واقف تھے اور نہ انہوں نے نفسیات کا مطالعہ کیا تھا، ملا صاحب فرماتے ہیں :-

> "در سن چہاردہ و پانزدہ سالگی حسن او قبول تمام عیاری بہم رسانیدہ بود چوں سال عمرش بہ بست رسید آبلہ سرشاری برآورد، بعد از انقضائے اشتداد و استخلاص زاں مرض تغیرے در چہرۂ او بہم رسید، چنانکہ ہر کس کہ او را دید تنفری کرد مولوی از اں مقدمہ بغایت آزردہ و دوربہم بود بنابراں آں از وطن خروج کردہ بہ ہندوستان کہ خانہ نشوونمائے نکتہ سنجان و دار العیار خردمنداں است آمد"

الغرض ملا صاحب کے خیال میں عرفی یہی نہیں کہ "خواجہ حسن" دہلوی کی طرح ایک حسین شاعر تھے بلکہ انہیں "حسن فروشی" کا بھی خیال تھا، اور جب چیچک کی دستبرد سے یہ حسن ظاہر جاتا رہا، تو لوگ ان سے ایسے متنفر ہوئے، کہ انہوں نے مجبوراً ترک وطن کیا، گویا شیراز قدرداں تھا، تو عرفی کے حسن کا، اور جب اسے "آبلہ سرشار" نے غارت کر دیا تو عشاق بوالہوس نے بھی کنارہ کشی کر لی، بندہ نواز، کیا سیرت نگاری کا اس سے زیادہ کوئی بدنما پہلو دکھایا جا سکتا ہے، ؟۔

اگر ملک عرفی کے علم و فن کا قدرداں تھا، تو چیچک نکلنے اور صاحب میخانہ کی تحقیقات کے مطابق، کریہ المنظر ہونے کے بعد بھی وہ اہلیت اسمیں موجود تھی، ایک اور مزہ کی بات آپ کے ملا صاحب نے یہ لکھ دی ہے کہ "ہر کس کہ او را دید تنفری کرد" مہربان من! کیا اس پر نفسیاتی نقطۂ نظر سے بھی نگاہ ڈالی، ؟ اگر ارباب وطن کا ذوق سلیم اسقدر اعلیٰ تھا کہ انہوں نے عرفی کی صورت سے نفرت کرنی شروع کی تو تعجب ہے

…بار مغلیہ کی پستی احساس پر کہ اس نے اسے مقربین خاص میں شامل کر لیا، اور شاہی خاندان سے اسکا، ایسا تعلق ہو گیا، کہ لوگوں نے شاہزادہ سلیم …اسے عاشق ہی مشہور کر دیا۔ ریاض الشعرا کی اس روایت سے کم از کم اتنا تو ضرور ثابت ہو جاتا ہے، کہ شاہزادہ سلیم کی صحبت میں اسے ایک خصوصیت …حاصل تھی، بھلا ایسا بدصورت انسان جسے دیکھنے والوں کو نفرت آئے، کیا جہانگیر جیسے حسن پرست انسان کے دربار میں باریاب ہو سکتا تھا …نفسیاتی تحقیق اسکی تائید نہیں کرتی لہذا صاحب میخانہ کی روایت جو عرفی کے اسباب سفر ہند کے متعلق ہے، یک لخت ساقط الاعتبار، …ور بالکل بے سر و پا افسانہ ہے، قراین یہی بتاتے ہیں، کہ عرفی کی تعلی نوازیوں سے ارباب وطن اکتا گئے تھے، اس لئے انہوں نے اس سے …تعلقات کشیدہ کر لئے تھے، یہی وجہ ہوئی کہ اسنے ہندوستان کا سفر کیا، براؤن کی یہی تحقیق ہے، جو لٹریری ہسٹری آف پرشیا کی تیسری جلد …کے اندر عرفی شیرازی کے ذیل میں پائی جاتی ہے۔

آپ نے صاحب میخانہ کی تحقیقات کے مطابق عرفی شیرازی کے قیام ہند کی مدت پندرہ سولہ سال متعین کی ہے۔ میں نے …صاحب مجمع النفایس کی روایت سے تاریخی استدلال کر کے صرف ایک سال کی مدت لکھی، اس معاملہ میں میرے نزدیک صاحب …مجمع النفایس پر ملا عبد النبی کی روایت کو تفوق حاصل ہے، لیکن میں صرف اسی ایک روایت کی بنا پر سراج الدین علی خاں آرزو جیسے …ثقہ ذاں مصنف کی تکذیب نہیں کر سکتا، مجمع النفایس میں صاف لکھا ہوا ہے۔

"تقی اوحدی گوید در سن سی و شش سالگی از صفاہان کہ مولد من است متوجہ شیراز کہ وطن اصلی آبا و اجدا است، متوجہ شدم بہ خدمت و صحبت مولانا عرفی رسیدم، پنج سال پیش از آنکہ او متوجہ ہند شود، اکثر در ملازمت و سفرہائے دیگر کہ مجمع بودند میرسیدم، و اشعار با بافغانی کہ در ایام طرح می شد تتبع می نمودم سن وے تقریباً سی سالہ بود"

اس سے صاف ظاہر ہے، کہ عرفی شیرازی جب تیس سال کے تھے، تقی اوحدی نے ان سے ملاقات کی اور اس واقعہ کے پانچ برس …کے بعد، انہوں نے ہندوستان کا سفر کیا، جب مآثر رحیمی کی روایت کے مطابق ۳۶ سال کی عمر میں عرفی کی وفات تسلیم کرتا ہوں تو نتیجہ یہی …نکلتا ہے، کہ وہ صرف ایک سال ہندوستان میں قیام پذیر رہے، اب اس روایت سے صرف صاحب میخانہ نے اختلاف کیا ہے تو چنداں …اہم نہیں، لیکن اگر اس کے ساتھ اور تذکرے بھی متفق ہیں، تو میں، آپکی تحقیق کو مان لوں گا۔ بشرطیکہ آپ اس پر اصول درایت کے لحاظ سے …روشنی ڈالیں، اور سراج الدین علیخاں آرزو کی روایت کو درایۃً پایۂ اعتبار سے گری ہوئی ثابت کر دیں۔

استخوان عرفی کا نجف اشرف پہونچنا

آپ نے اس عنوان کے ذیل میں بھی چند دل خوش کن باتیں لکھی ہیں، اس سلسلہ میں آپکو …مجھ سے تین اقتباسات کے متعلق اختلاف ہے، پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ نے میرے الفاظ …سے یہ نتیجہ نکالا ہے، کہ خود میر صابر اصفہانی استخوان عرفی کو نجف اشرف لے گئے اور آپ نے اپنے خیال کی تائید میں میری سطور کا اقتباس …بھی درج کر دیا ہے، لیکن مجھے افسوس ہے کہ آپکی یہ سعی بھی کامیاب نظر نہیں آتی، آپ "خود" کا لفظ کہاں سے لائے، میں نے لفظ "خود" نہیں …لکھا، اب اپنے استنباط کی حقیقت دیکھئے، کیا یہ محاورہ نہیں ہے، کہ ہم اپنے زیر اثر کوئی کام کریں اور اسے اپنی طرف منسوب کریں خواہ اس

عمل میں میرے ہاتھ پیر کو جنبش ہوئی ہو، اگر میں کہوں کہ "فلاں باغ میں نے لگایا ہے" تو کیا آپ اس سے یہ نتیجہ نکالیں گے کہ ایک مزدور کی طرح دن بھر دھوپ میں مرمر کر میں نے درخت بھی اپنے ہاتھ سے لگائے ہیں۔ ابن عباس سے ایک روایت منقول ہے جو اہلسنت اور اہل شیع کے درمیان سخت متنازعہ فیہ ہے، یہ حدیث مسلم شریف میں بھی موجود ہے، اور بخاری شریف کی کتاب المرضیٰ میں بھی پائی جاتی ہے، سرور کائنات صلعم کا آخری وقت تھا، آپ فرماتے ہیں ھلم اکتب لکم کتاباً لا تضلوا بعدہٗ حدیث میں لفظ "اکتب" واحد متکلم کا صیغہ ہے جسکا ترجمہ ہے "لکھدوں" یہ ظاہر ہے کہ سرور کائنات ایک "امی" شخص تھے اس لئے اس کے معنے یہی لئے جاویں گے کہ "لکھوا دوں" چونکہ آپ کی تحریک، اور آپ کے زیر اثر آپ کے خیالات کی ترجمانی ہوتی، اس لئے گویا آپکا "لکھوا دینا" عین "لکھنا" تھا، اسلئے آپکا یہ اعتراض بھی بالکل بے معنی ہے، ہیں اگر لفظ "خود" یا "بنفس نفیس" لکھتا تو آپکا یہ اعتراض حق بجانب تھا۔

آپ فرماتے ہیں کہ ملا عبد النبی نے وفات کے ۲۵ سال کے بعد استخواں عرفی کا نجف اشرف میں دفن ہونا بیان کیا ہے۔ لیکن مجھے اصرار ہے کہ مآثر رحیمی زیادہ معتبر ہے جسمیں "تیس سال" موجود ہے، اور مآثر رحیمی کی تحقیق کے ساتھ اور بھی تذکرے اس خیال کی تائید کرتے ہیں، جنکا حوالہ میں اپنے مضمون میں پیش کر چکا ہوں۔

آپنے آخر میں یہ نظریہ بھی بڑی شد و مد سے پیش کیا ہے، کہ میرے ہی قول سے میرے خیال کی تردید ہوتی ہے، جب میں یہ تسلیم کرتا ہوں، کہ عرفی نے ۹۹۹ھ میں وفات پائی، اور تیس سال کے بعد انکے ریزہ ہائے استخواں کو لوگوں نے نجف اشرف میں دفن کیا، تو اس حساب سے نجف اشرف میں دفن ہونیکی تاریخ ۱۰۲۹ھ ہوتی ہے، اور میں نے ملا رونقی کا جو قطعہ پیش کیا تھا، اس سے ۱۰۳۲ھ نکلتا ہے لہذا میرے ہی قول سے میری تردید ہوگئی، اور صاحب میخانہ کی تحقیق کہ "عرفی نے ۱۰۰۲ھ میں انتقال کیا" پایۂ ثبوت کو پہونچ گئی حالانکہ آپنے اپنے خیال میں ان متضاد واقعات کے متعلق جو تنقید کی ہے، وہ ناظرین نگار کیلئے اور بھی باعث دلچسپی ہوگی، جب وہ یہ غور کریں گے کہ آپنے ملا رونقی کی جس تاریخ سے استدلال کیا ہے، وہ آپ کے نزدیک مستند بھی ہے یا نہیں؟ آپ تو ملا عبد النبی کی روایت کے مطابق ۲۵ ہی سال کے بعد عرفی کے استخواں کا نجف اشرف میں دفن ہونا تسلیم کرتے ہیں نا؟ اور جب یہ بھی آپ مانتے ہیں، کہ انہوں نے ۱۰۰۲ھ میں وفات پائی، تو اب دو ہی صورتیں باقی رہ جاتی ہیں یعنی ملا رونقی کی تاریخ آپ کے نزدیک صحیح ہوئی، یا غلط، اگر تاریخ غلط نکالی گئی ہے تو بحث ہی ختم ہے، اگر صحیح ہے، تو آپ کو ماننا پڑیگا کہ عرفی کی وفات ۱۰۰۷ھ میں ہوئی نہ کہ آپ کی تحقیق "میخانہ" کے مطابق ۱۰۰۲ھ میں کیونکہ جب ۱۰۳۲ھ میں سے ۲۵ نکال لینگے تو ۱۰۰۷ھ باقی رہجاویگا، ملا رونقی کی تاریخ جس طرح آپ کے خیال میں میرے دعوی ۹۹۹ھ کو ثابت کرنے کے لئے غیر مفید ہے۔ اسی طرح آپکی تحقیق کے مطابق عرفی کی وفات ۱۰۰۲ھ کے دعوی کو باطل ٹھیرا رہی ہے۔

عبد المالک آروی

تعزیرِ جُرم

افسانہ

(۱)

شبِ تاریک اپنی زندگی کی آخری گھڑیاں بہ سرعت تمام ختم کر رہی تھی۔ سوسن جو چند لمحوں کا مہمان سمجھا جا رہا تھا زندان کے ایک گوشہ میں مصروفِ الحاح و مناجات تھا۔ دفعتاً دروازہ کھلا اور سوسن نے دیکھا کہ شمع ہاتھ میں لئے شاما اس کے سامنے کھڑی تھی۔ اس کے ایک اشارۂ مبہم پر سوسن کی بیڑیاں کاٹ ڈالی گئیں۔

"تم میرے لئے مایوسی کے سیاہ بادلوں سے نورِ رحمت بن کر نمودار ہوئی ہو" سوسن نے کہا۔

"نورِ رحمت!" زیرِ لب کہتے ہوئے شاما نے ایک ایسا زور کا قہقہہ لگایا جیسے گرجتے ہوئے بادل دیوانہ وار برس پڑیں۔ ہراساں بھوتوں کے غول کے مانند اس کی صدائے بازگشت زندان کی دیواروں سے ٹکرا کر لوٹی۔

(۲)

دریائے برونا کے کنارے ناریل کے درختوں کی دھندلی قطاروں میں پو پھٹ رہی تھی۔ شاما نے کشتی میں قدم رکھتے ہوئے کہا "آؤ پیارے زمانۂ ماضی کے مصائب و آلام بھول کر اب کہیں چلے چلیں"

دریا کی افتاں و خیزاں موجوں میں کشتی سبک سیر روانہ ہوئی۔ سوسن نے شاما کے سر کو اپنے سینہ سے لگا کر کہا۔ "ہاں! یہ تو بتاؤ کہ ابدی زنجیروں میں جکڑنے کے لئے تم نے میری آزادی کس قیمت پر خریدی؟"

شاما جو اس کے سینہ سے لپٹی تھی زیادہ زور سے لپٹ گئی اور کہا۔ "ابھی نہیں"

(۳)

موجوں کے ساتھ ساتھ بہنے والی کشتی پر آفتاب پرتو فگن ہونے لگا۔ عورتیں اشنان کر کے بھیگے جسم اور لباسوں میں سروں پر پانی کے گاگر لئے گھروں کو واپس ہو چلی تھیں اور صبح کا بازار برخاست ہو چکا تھا۔ دو رویہ بانس کے درختوں کی قطاروں والی سڑک پر سکوتِ مطلق طاری تھا۔ جنگل کے پھولوں کی نکہت سے معمور ہوا کے جھونکوں سے شاما کی نقاب اُلٹ گئی۔

سوسن نے رکتے رکتے پوچھا "کیا تم اپنے احسان سے مجھے کبھی آگاہ ہونے نہ دو گی؟ اگر میں اس بار سے سبکدوش نہ ہو سکوں تو کم از کم اس کے مایوسانہ محاسبہ سے تو پیہم لطف اندوز ہوتا رہوں گا۔ شاما نے اپنی نقاب کو درست کرتے ہوئے جواب دیا "ابھی نہیں"

(۴)

رات کے تاریک ساحل پر روشنی چلی آ رہی تھی۔ کشتی اس ویران مندر کے قریب پہونچ گئی جو لبِ جو برگد کے زیرِ سایہ واقع تھا کمسن چاند ابر کی ہلکی نقاب میں منہ چھپائے دریا کی لہروں پر اسی طرح رقصاں تھا جس طرح کسی ننھے بچہ کی کاغذی ناؤ۔

رات بتدریج تاریک ہونے لگی اور تاریکی کے ساتھ اس سوال کی ہولناکی اور اہمیت بھی بڑھتی گئی جو دن بھر شرمندۂ جواب نہ ہو سکا تھا۔

شاما نے ایک ٹھنڈا سانس بھرا اور کہا "میں نے جو کچھ تمہارے لئے کیا ہے وہ تکلیف اور قابلِ ملامت ضرور ہے اور پھر تم سے اس کا اعادہ اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ ہے۔ مگر میں مختصراً بیان کرتی ہوں۔ میں چاہتی ہوں کہ سنتے ہی تم اس کو فراموش کر دو۔ نوجوان پوٹیا نے جو میرا عاشقِ زار ہے تمہارے جرم کو اپنے سر محض یہ ثابت کرنے کی خاطر لے لیا ہے کہ میری خوشنودی کیلئے کس طرح اپنی جان نثار کر سکتا ہے۔

"میرے اچھے محبوب! میں نے اپنی زندگی کے اس گناہِ عظیم کا ارتکاب تمہارے لئے ہاں فقط تمہارے لئے کیا ہے"

(۵)

چاند رخصت ہو چکا اور جنگل ایک سکوتِ تاریک میں ملفوف ہے۔ سوسن کے اُس ہاتھ کی گرفت جو شاما کی کمر میں حلقہ کئے ہوئے تھا، کمزور ہو گئی اور دونوں علٰحدہ ہو گئے اب انہیں ہر شئے ایک دوسرے سے معتًا دور کرنے لگی، حتّٰی کہ انکی خاموشی اور درمیانی فاصلہ بھی دونوں میں حائل ہو گیا شاما فوراً جھکی اور سوسن کے قدموں پر سر رکھدیا۔ آنسو خشک تھے اور آواز بھرائی ہوئی اس نے کہا "خیر خدا مجھے سزا دیگا مگر تم ہرگز نہ دینا"

سوسن اپنے کو چھڑا کر کشتی سے کود پڑا اور رات کی بے پایاں تاریکی میں غائب ہو گیا۔

(۶)

پاؤں میں روندے جانے سے بکھرے ہوئے سوکھے پتے کھڑکھڑانے لگے۔ ہوا پھولوں میں بسی ہوئی تھی درختوں کی پُرپیچ و خم شاخیں کسی خواب پریشاں کے بھوتوں کی نقالی کر رہی تھیں۔ آخر کار وہ تھک کر بیٹھ گیا اور اس کو یکایک اسکی موجودگی کا احساس ہوا جو اس کا تعاقب کر رہی تھی جیسا کہ خاکسترِ سیاہ صحرائی آگ کے شعلوں کا کیا کرتا ہے۔ "مجھے چھوڑ دو" اُس نے چیخ کر کہا لیکن وہ اس سے لپٹ گئی اور لگاتار بوسوں کی بوچھار کر دی۔ دم پھول رہا تھا بال پریشان تھے اور نقاب زمین پر لوٹ رہی تھی۔ "نہیں! نہیں!! ہرگز نہیں!!!" شاما نے چلا کر کہا "تم اپنے ہاتھوں سے میرا گلا گھونٹ ڈالو تاکہ ہم دونوں کے گناہ برابر ہو جائیں"۔ جنگل کے سائے کانپ اٹھے اور درختوں پر ہیبت طاری ہو گئی گلا گھٹنے کی ایک چیخ کے ساتھ کسی کے گر نے کی آواز سنائی دی۔

(۷)

خورشیدِ خاوری کی سنہری کرنیں مندر کے کلس کو یوں جگمگا رہی تھیں گویا کسی دیوتا کی خشمگیں نگاہیں ہیں۔ سوسن اس جگہ سے

نکل کر ویران ریگستان میں بھٹکتا رہا۔ آفتاب نصف النہار نے اپنی تمازت سے اس کے خون میں بخار کی سی حرارت پیدا کردی تھی آفتاب غروب ہوگیا اور گرد و پیش تاریکی چھانے لگی۔

سوسن اک عالم وارفتگی میں کشتی کیطرف واپس چلا۔ کشتی میں اس کو ایک طلائی کنگن ملا جو غروب ہونے والی آفتاب کی شعاع کے مانند دمک رہا تھا۔ لپک کر اٹھا لیا اور سینہ سے لگایا۔ اپنا چہرہ اس نیلی نرم شال سے ڈھانک لیا جو وہاں دھری تھی۔ وہ بے اختیار چاہتا تھا کہ اسکی گریۂ پانکہت کو اپنی ہستی میں جذب کرلے اور اسکی خلش پیہم سے لذت اندوز ہوتا رہے۔

(۸)

رات بڑھتی گئی ہلکے ابر کی چادروں میں ماہ منیر دھندلا نظر آنے لگا۔ سوسن کشتی پر کھڑا تھا۔ صحرا کے دہشتناک سکوت کیطرف مخاطب ہوکر بے اختیار چیخ اٹھا "میری اچھی شاماؔ! تو اب زندہ ہوجا! آ اور مجھ سے مل جا"

ایک سایہ تھا یا واہمہ جو تاریکی کے پردہ سے ریت پر نمودار ہوا اور کشتی میں قدم رکھتے ہوئے گویا ہوا "لو میں آگئی۔ تمہارے دست کرم نے ذراسی لغزش کی اور مجھے موت کے منھ سے بچالیا۔ سوسن کی آنکھیں مضطربانہ اشتیاق میں اس پر جم گئیں۔ اسنے شاماؔ کو سینہ سے لپٹانے کے لیے ہاتھ پھیلا دیے۔ معاً کانپ اٹھا، پیچھے ہٹا اور چلاکر کہا "پھر تو کیسے آگئی؟"

(۹)

شاماؔ ایک لمحہ تک مبہوت کھڑی رہی۔ بعد ازاں سر تسلیم خم کرکے اُس خواب کی طرح بے پتہ ہوگئی جو بیداری کے قریب ہوچکر پھر شب تار کی وسعتِ لامتناہی میں مفقود ہوجائے

(ترجمہ) ظہیر احمد بی اے۔ ایچ سی۔ ایس

ضرورت ہے

اگر آپ کو خیمے دریاں اور چرمی سامان کی ضرورت ہو تو فوراً ہمیں کارڈ لکھئے ہمارے یہاں ہر قسم کا سامان نہایت ارزاں ملتا ہے والی ریاست بڑے بڑے رؤسا ہمارے ہی یہاں سے منگاتے ہیں۔ فہرست اردو ہندی یا انگریزی کی منگاکر ملاحظہ فرمائیے، ہمارا کارخانہ صداقت کی وجہ سے تمام ہندوستان میں مشہور ہوگیا ہے۔

محمد حسین اینڈ کو ٹنٹ مرچنٹ فتحگڑھ (یو۔پی)

فطرت کے حضور میں علم و حکمت کی بیچارگی

اور

کائنات میں عقول انسانی کی بے دست پائی

ایک عالم و عامی کا مکالمہ

مادیین کے مذہب میں سب سے زیادہ مہتم بالشان مسئلہ مادہ (Matter) اور جوہر فرد (Atom) کا ہے کیونکہ اسی پر انحصار تمام مظاہر علمی کا ہے۔ اور اس میں کلام نہیں کہ عقول انسانی نے کوئی دقیقہ کوشش کا ان کی حقیقت کا علم حاصل کرنے کے لئے اٹھا نہیں رکھا لیکن اگر یہ سوال کیا جائے کہ کیا کوئی قابل اطمینان نتیجہ اس وقت تک پیدا ہو چکا ہے تو اسکا جواب سوائے اس سکوت و حیرانی کے اور کچھ نہیں ہو سکتا جو جہل آنکھا ولین یوم میں پائی جاتی تھی۔

نگار کی کسی گذشتہ جلد میں ہم مادیین کے مذہب پر تفصیلی بحث کر چکے ہیں اور اس کے بعد بھی اکثر و بیشتر اس قسم کے علمی مضامین شایع ہوئے ہیں، آج ہم ایک مضمون کا اقتباس پیش کرتے ہیں جس میں جوہر فرد پر مکالمہ کی صورت سے لطیف بحث کی گئی ہے۔

یہ مضمون سائنٹفک امریکن میں شایع ہوا تھا جس سے "المقتطف" نے لیا اور اس سے ہم نے۔　　نیاز

عامی - "میں جوہر فرد کو دیکھنا چاہتا ہوں"

عالم - "میں خود بھی اتنا عرصہ سے دل میں لئے ہوئے ہوں"

عامی - "تو کیا آپ نے ابتک جوہر فرد کو نہیں دیکھا، میں تو سمجھتا تھا کہ آپ کے پاس بڑے بڑے نازک و دقیق آلات ہیں، نہایت عجیب و غریب خوردبینیں ہیں، آپ نے ضرور اسے دیکھ لیا ہوگا"

عالم - "نہیں یہ تمام آلات اس کی حقیقت معلوم کرنے سے عاجز ہیں۔ جواہر فردہ (Atom) کے حجم کا تعلق ان عوامل سے ہے

جو نظر نہیں آسکتے۔ ایک قوی دوربین زیادہ سے زیادہ ایک انچ کے لاکھویں حصہ کو سامنے لے آتی ہے، لیکن جب ایک انچ کے لاکھویں حصہ میں کروروں جواہر فردہ پائے جاتے ہوں تو دوربین کیا کام دے سکتی ہے، علاوہ اس کے یوں بھی انکی حقیقت کا پتہ نہیں چل سکتا کیونکہ وہ ہمیشہ حرکت میں رہتے ہیں اور متحرک اشیاء کی حقیقت کا ادراک اور زیادہ دشوار ہے۔"

عامی۔ "پھر یہ بتائیے کہ تمام وہ حقائق جو جواہر فردہ سے مرتبط ہیں انکا علم آپ کو کیونکر ہوا؟"

عالم۔ "جو کچھ ہمیں معلوم ہوا ہے وہ نہ معلوم ہونے کے برابر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمیں اسوقت تک جواہر فردہ کا تو کچھ علم ہی نہیں حاصل ہوا۔ اگر کچھ معلوم ہوا ہے تو صرف یہ کہ اس کی مختلف کیفیات کیا ہوتی ہیں۔ مثلاً طبعی اور کیمیاوی تجربوں میں حرارت، رطوبت، برودت، مقناطیسیت، کہربائیت وغیرہ حقیقتاً جواہر فردہ کے مختلف تاثیرات ہیں نہ کہ عین جوہر فرد، اسلئے ہمارا علم صرف اس کی تاثیرات کے علم تک محدود ہے۔ اس کو ہمنے آجتک نہیں دیکھا۔"

عامی۔ "مجھے ایک سوال کرنے کی اجازت دیجئے۔ کیا یہ دعوی نہیں کیا گیا کہ جوہر فرد نظام شمسی کیطرح ہے یعنی جس طرح آفتاب کے گرد اس کے ماتحت کرے گردش کرتے ہیں، اسی طرح جوہر فرد کے اندر بھی ایک چیز اصل ہے جسے اصطلاح میں (نواۃ) کہتے ہیں اور اس کے گرد بیشمار برقپارے (Electrons) گردش کر رہے ہیں؟"

عالم۔ "ہاں، ڈنمارک کے ایک عالم بوہر کی یہی رائے تھی اور ایک حد تک مفید بھی تھی۔"

عامی۔ "تھی؟ تو کیا اب نہیں ہے"

عالم۔ "بات یہ ہے کہ بوہر کی بتائی ہوئی حقیقت علوم جدیدہ کے تمام مطالب کے لئے مفید ثابت نہیں ہوتی اور پروفیسر بوہر خود بھی اس کو جانتا تھا، لیکن چونکہ اس سے بہتر کوئی نظریہ اس سے قبل قایم نہیں ہوا تھا اسلئے علماء نے عارضی طور پر کام چلانے کے لئے اسکی صحت کو تسلیم کر لیا تھا۔

عامی۔ "حیرت ہے، میں تو یہی سمجھتا تھا کہ بوہر کے اس نظریہ میں نقایص ہیں۔ مجھے تو جرائد و رسایل سے یہی معلوم ہوا کہ وہ تمام مطالب علمی کے موافق ہے اور بڑا اکتشاف ہے"

عالم۔ "اس کے اکتشاف عظیم ہونے میں شک نہیں کیونکہ بہت سے مباحث علمی ہیں اس سے مدد ملتی تھی اور اسلئے علماء نے اس کو تسلیم کیا لیکن بعد کو تحقیق سے معلوم ہوا کہ تمام مسایل علمیہ میں یہ نظریہ کام نہیں دے سکتا اسی لئے جوہر فردہ کے شکل کی تعیین میں ہمیشہ ارتقاء بحث کے ساتھ ساتھ تغیر ہوتا رہتا ہے۔"

عامی۔ "سب سے پہلے کس نے جوہر فرد کی شکل کے تعیین کی"

عالم۔ "قدماء کا گمان تھا کہ مادّہ ذرات دقیق سے مرکب ہے، لیکن انہوں نے تجربہ کی کسوٹی پر اس خیال کو کبھی نہیں آزمایا تھا۔ بعد کو جدید علمی دنیا میں سب سے پہلے نیوٹن نے اپنی کتاب "بصریات" میں ان ذرات سے بحث کی اور بتایا کہ وہ متحرک ہیں، سخت ہیں، اور انکا تجزیہ نہیں ہو سکتا۔ اس نے ظاہر کیا کہ اجسام مادی کی نرمی و سختی کا انحصار انہیں اجزاء کی زیادتی

دکی اور تفاعل پر ہے۔ اس کے ۲۰۰ سال بعد لارڈ کالون نے اس کو بالکل الٹ کر یوں ظاہر کیا کہ اجسام کی سختی کا سبب نرم ذرات ہیں جو سریع حرکت کرتے رہتے ہیں۔

عامی۔ "درست ہے، مجھے یاد آگیا کہ کالون نے جوہر فرد کو "حلقۂ دخان" سے تشبیہ دی تھی"

عالم۔ "ہاں اس نے بتایا تھا کہ جواہر فردہ ایتھر میں گردش کر رہے ہیں جن کے ساتھ ور شامل ہے"

عامی۔ "پھر کیا ہوا؟"

عالم۔ "پچاس سال تک کالون کا بتایا ہوا جوہر طبیعات میں کام دیتا رہا کیونکہ اس ذریعہ سے بعض ایسے امور کی تفسیر بیان ہو سکی جو اس سے قبل کے نظریہ کے ماتحت بیان نہیں ہو سکتے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ اس نظریہ میں بھی ایک نقص نکل آیا، اور وہ یہ کہ اس نے جوہر فرد میں جذب کو تسلیم نہیں کیا اور مادہ کی تکوین جواہر سے ممکن نہیں جب تک انمیں باہم گر جذب و کشش کو نہ مانا جائے"

عامی۔ "پھر اس کمی کو کیوں کر پورا کیا گیا؟"

عالم۔ "اس کے بعد ایک زمانہ گذر گیا اور کوئی خاص رائے قائم نہ ہو سکی۔ گذشتہ قرن کے آخر میں پروفیسر رولینڈ نے دعوی کیا کہ جوہر فرد کی بنا، پیانو کی بنا کی طرح پیچیدہ و گرہ دار ہے"

عامی "میرے خیال میں تو ہمر کا نظریہ رولینڈ کے نظریہ سے زیادہ بسیط تھا"

عالم۔ "ہاں، رولینڈ اس وقت تک زندہ نہ رہا کہ علوم طبیعیہ کے جدید ترقی کے سلسلہ میں رانتجنی شعاعوں (X - rays) اور عناصر منورہ کے اکتشاف کا حال اسے معلوم ہوتا کیونکہ ان جدید اکتشافات سے ایک امر نہایت عجیب و غریب یہ ثابت ہو گیا کہ جوہر فرد کا کہربائی ماننا ضروری ہے"

عامی۔ "ہمیں شاید یہ بھی ماننا پڑیگا کہ اس میں قوت جذب و کشش پائی جاتی ہے"

عالم۔ "نہیں، یہ اس کی لازم صفت نہیں ہے"

عامی۔ (حیرت سے) "کشش اس کی لازم صفت نہیں ہے! حالانکہ ابھی آپ لارڈ کالون کے نظریہ کو ناقص بتا رہے تھے، جمیں کشش کو تسلیم نہیں کیا گیا۔ اتنے عرصہ میں وہ کونسا ایسا نیا شخص پیدا ہو گیا، جس نے جوہر کے صفت کشش کو جو لازم مانی جاتی تھی غیر لازم کر دیا"

عالم "اینشٹین"

عامی۔ "یہ کیا فرماتے ہیں"

عالم۔ "اس نے کہا کہ اجسام میں باہم کشش و جذب نہیں ہے بلکہ فضا کی شکل جسمیں اجسام حرکت کر رہے ہیں ایسی ہے کہ ایک جسم دوسرے جسم سے مل جاتا ہے"

"ان میں باہم کشش ہو یا نہ ہو لیکن یہ تو مسلّم ہو گیا کہ بوہر نے جو صورت جوہر کی پیش کی تھی وہ زیادہ بسیط ثابت ہوئی"

"نہیں بوہر کا نظریہ بھی کافی ثابت نہیں ہوا

"پھر اس کے بجائے اور کیا رکھا گیا؟"

"شروڈنگر کا نظریہ، جس کو قائم ہوئے صرف تین سال کا زمانہ گزرا ہے"

"کیا وہ نظریہ بھی کہربائی ہے؟"

"ہاں، ہے تو وہی کہربائی لیکن بوہر کے نظریہ سے وہ کچھ مختلف ہے بوہر کا نظریہ تو یہ ہے کہ جوہر کے اندر ایک پروٹن ہے جسکے گرد برقپارے یا کہارب اجرام فلکی کی طرح گردش کر رہے ہیں یعنی پروٹن کی کہربائیت ایجابی ہے اور کہارب کی سلبی گویا اس طرح جوہر کے اندر کہربائیت معین نقطوں میں مرکوز ہے جنھیں پروٹن اور کہارب کہتے ہیں۔ دوسرے نظریہ کے موافق اسمیں کہربائیت ہر جگہ پھیلی ہوئی ہے، دوسرا فرق یہ ہے کہ بوہر کے جوہر میں کہارب ہر وقت حرکت کرتے رہتے ہیں اور شروڈنگر کے نظریہ کے مطابق وہ ساکن ہیں مگر ان کو قدرت حاصل ہے کہ اوقات معینہ اور نقاط معینہ میں اپنی کہربائیت کی مقدار بدلتے رہیں اور یہی تغیر ہے جو فضار میں امواج نور پیدا کرتا ہے۔

"اب آپ یہ فرمائیے کہ یہ نظریہ آپ کے تمام مطالب کیلئے کافی ہے یا نہیں؟"

"ہاں یہ نظریہ نہ صرف تمام ان ظواہر کی تعلیل کے لئے کافی ہے جن کے نظریۂ بوہر کے مطابق تعلیل ممکن تھی بلکہ بعض ایسے ظواہر کی بھی تعلیل اس سے ہوتی ہے جو اس قبل ناممکن التعلیل تھے"

"اس وقت تو آپ یہی سمجھتے ہیں، لیکن ممکن ہے ایک دن آپ اس نظریہ کو بھی ناقص کہنے لگیں"

"بالکل ممکن ہے، کیونکہ انسان کا شعور ہنوز مرتبۂ کمال سے بہت دور ہے، اور کون کہہ سکتا ہے کہ آیندہ کے تجربات کیا کیا اور جدید نظریہ پیدا کر نیپر مجبور کرتے ہیں اور ہمکو اپنے قصور فہم کا اعتراف کن کن طریقوں سے کرنا پڑیگا۔

مکمل تاریخ اسلام

۵ جلدوں میں

مصری ادیب و مورخ علامہ محی الدین کی عربی زبان کی تاریخ اسلام کا نہایت سلیس ترجمہ اس تاریخ میں عہد نبوی اور ظہور اسلام سے لیکر حکومت اندلس تک کے تمام عہد کے واقعات نہایت جامعیت کے ساتھ دلچسپ انداز میں یکجا کر دئے گئے ہیں۔ اردو میں اس سے زیادہ معتبر و جامع، سلیس و مختصر تاریخ اسلام اور کوئی مرتب نہیں ہوئی۔ قیمت صہ محصول معاف۔

منیجر "نگار" لکھنؤ سے طلب فرمائیے

فضاء بسیط اور ہم

ابھی شب کے پردہ میں سورج گیا تھا　　پرند اب لیا چاہتے تھے بسیرا
شفق مل چکی تھی ابھی منھ پہ غازہ　　نکھرنے ہی والا تھا مکھڑا قمر کا

بس اب گرم ہونے کو تھی بزم انجم
اونڈ لنے کو تھے بادۂ نور کے خم

کہ اتنے میں حیرت نے آنکھوں میں چھاکر　　جہالت کی تاریکیوں کو مٹاکر
نظر کو مری سوئے گردوں اٹھاکر　　سڑک کہکشاں کی فلک پر دکھاکر

کہا دیکھنا ہے اگر کچھ تماشا
تو اس راہ سے تجھ کو چلنا پڑے گا

خیال اتنے میں مجھ کو ہیئت کا آیا　　تخیل کی پریوں کو ساتھ اپنے لایا
مجھے اون کے تخت رواں پر بٹھایا　　پھر اس تخت کو سوئے گردوں اڑایا

یہ اوج مقدر تو دیکھو کہ اخگر
ہوا جاکے مہمان خورشید خاور

پہونچ کر وہاں بس یہ جی میں سمائی　　کہ اب کیجئے سیر بلغ خدائی
فضاء کی طرف جب نظر اک اٹھائی　　تو دیکھا کہ دانائی کبریائی

طلسمات حیرت دہ دکھلا رہی ہے
کہ دیوانگی عقل پر چھا رہی ہے

وہ فانوس حسن ثوابت کے جلوے　　وہ گردش میں پروانے سیارگاں کے
چراغ قمر نور پر جن کے صدقے　　وہ تاروں بھرے جگمگاتے اوجالے

نہ دن رات ہے واں نہ شام و سحر ہے
تجلّی مطلق فقط جلوہ گر ہے

ہر اک شے ہے اطراف عالم سے خالی — نہ دہنے نہ بائیں نہ اونچی نہ نیچی
نہ وقت گذشتہ کے ہیں کوئی معنی — نہ ہے آنے والے زمانہ کی ہستی

فقط ایک موجودگی کا نشاں ہے
یہاں میں وہاں ہے وہاں میں یہاں ہے

خدایا تری رحمتوں کے سمندر — سمائیں تصور کے قطروں میں کیونکر
یہ کچھ وسعتیں چھائی ہیں وسعتوں پر — کہ حیرت بھی کہتی ہے اللہ اکبر

جو دل میں خیال فلک کو میں لایا
تو اک بلبلے سے زیادہ نہ پایا

گیا پھر میں ذرّوں کی مخفی تہوں میں — اُڑا میں ہواؤں میں اور بادلوں میں
جو ڈوبا سمندر کی گہرائیوں میں — تو اچھلا پھر افلاک کی رفعتوں میں

نشاں اوس کے کوچہ کا لیکن نہ پایا
یہ عالم ہے سب جسکی ہستی کا سایہ

نہ پوچھو فضا جس کو کہتے ہیں کیا ہے — خلا میں وہ دریا سا کچھ بہہ رہا ہے
نہ کچھ عرض اور طول کی ابتدا ہے — نہ جس کے عمق کی کوئی انتہا ہے

کُرے تیرتے پھرتے ہیں مثل ماہی
چھڑکتے ہوئے نور فیض الٰہی

نہ پیمائشوں کی وہاں ہے سمائی — نہ میل اور فرسنگ کی ہے رسائی
نہ کچھ علم عدد کی واں بن آئی — عیاں ہندسہ کی ہے بیدست و پائی

تفکر دلائل قیاس اور توہم
پہونچکر وہاں ہو گئے سب کے سب گم

اگر باغ سے توڑ لو ایک پتا!! — سمندر سے بھر لو اگر کوئی کوزہ!!
جو اڑ جائے صحرا میں سے ایک تنکا — زمیں پر سے مٹ جائے گر ایک ذرہ

تو باغ اور صحرا زمیں اور سمندر
رہیں گے یہ سب کچھ نہ کچھ اپنا کھو کر

مگر سب نظام اور یہ سورج ہمارا — اگر آن واحد میں ہو پارہ پارہ

اگر یہ فلک اور ہر ایک تارا فنا ہو کے اُڑ جائے سارے کا سارا
کمی شان ہستی میں ہو گی نہ اتنی
اُڑ دِ پر سفیدی کی مقدار جتنی

قیاس وگماں سے ہی بے شبہ باہر کہ اک بوند میں ڈوب جائے سمندر
تعجب سے خالی ہو یہ بات کیوں کر کہ ذرہ میں چھپ جائے خورشید خاور
بہ ظاہر یہ ہے جزو کا کُل سے بڑھنا
تامل مگر ماننے میں نہ ہو گا!!

جو بکری کبھی شیر کو پھاڑ ڈالے اگر مارے خرگوش تازی کے بھالے
اگر بھیڑیئے کو کوئی بھیڑ کھالے ہرن بھی کرے چیتے کے گر نوالے
یہ باتیں نہیں گو طلسمات سے کم
یقیں ان پہ لانے کو ہیں مستعد ہم

مگر حد امکان سے بالکل ہے باہر کہ قابو ہو قدرت کی پیمائشوں پر
پٹکتا ہے سائنس ٹپکا کرے سر بنائے بنا تا ہے منھ فلسفہ گر
ذہانت بھی زور اپنا سارا لگائے
قلابے زمیں آسماں کے ملائے

مہا سنکھ صدیوں کا دور اک بنالوں مہا سنکھ پھر دور ایسے جو پاؤں
گھڑی بھر میں ان سارے دوروں کو سمجھوں یہ گھڑیاں میں پھر آپ کو اس قدر دوں
کہ جن سے بنیں دن دنوں سے مہینے
بنیں پھر مہینوں سے سو سال پورے

کروں فرض اک دن اب ان سو برس کا پھر ایسے دنوں کا بنالوں مہینہ
کروں جمع ایسے مہینہ جو بارہ تو اک سال بن جائے گا اُنکا پورا
کروڑوں مہا سنکھ پھر سال ایسے
مددگار ہوں میری عمر رواں کے

پھر اک سرعت برق کا اسپ آئے مجھے اپنی پشت رواں پر بٹھائے
کُرّوں سے کُرّوں تک وہ پھر اُڑ کے جائے وہ بے انتہا اس میں صدیاں لگائے۔

مگر سب کی سب پھر بھی ہستی قریبًا
رہیگی نگاہوں سے پنہاں یقینًا

مبارک ہے لیکن یہ بے انتہائی حقائق شناسوں کی بیدست و پائی
یہ قدرت کے میداں یہ بیحد خدائی بڑے کام آئی بڑے کام آئی!!

اسی بات سے اور اسی کے بدولت
کھلا کرتی تھی نت نئی اک حقیقت

خدا ہم کو دیتا اگر عقل کامل جو ہوتا ہمیں علم ہر شے کا حاصل
نہ طے کرنی پڑتی کبھی کوئی منزل پڑے رہتے بستر پہ بن بن کے کاہل

یہ محنت کے باغوں کی باد بہاری.
کسے ہوتی معلوم یوں پیاری پیاری

مجنوں اگر لطف کھانے کا چاہو تو پھر بھوک کی بھی تو سختی اٹھاؤ
کرو ہمت اے آب رحمت کے پیاسو پسینے بہا کر کنویں کھود ڈالو

ذرا بھی پڑی جس کو محنت کی عادت
سمجھ لو کہ ہے اس کے قدموں میں راحت

غرض نوع انسان کی یہ کم علمی ہے اک وجہ ہر چیز کے جاننے کی
سمجھ سوچ میں ہے خدائی ہے کیسی ہے پستی کی تہ میں چھپی کیوں بلندی

مقید نہ ہوتے جو ہم اس زمیں پر
تو اٹھتے سوالات یہ دل میں کیونکر

کہ اے چرخ کیونکر تری کل چلی ہے تجھے شکل اے چاند یہ کس نے دی ہے
ستاروں کی تم تم کو سورج ہی کی ہے بتاؤ تو کس کی یہ جادوگری ہے

شراب کمال اپنی کس نے پلا کر
تمہیں بے خودی کے دیے ہیں یہ چکر

یہ مانا کشش کی یہ کاریگری ہے! کشش تم میں لیکن یہ کس نے بھری ہے
کسی نے تو تم میں یہ غیرت دھری ہے کہ شرمندہ اڑنے میں تم سے پری ہے

یہ کیا ہے یہ قانون قدرت ہی کا ہے

یہ سامان صرف اپنی حیرت ہی کا ہے

کہاں ہیں وہ جو منکر ان خدا ہیں
تمہیں دیکھیں، آنکھیں اگر انکی وا ہیں

وہ اپنی ہلاکت پہ کیوں مبتلا ہیں
یہ روحانی خونخواریاں کب روا ہیں

ہے علت کوئی جس کے معلول ہو تم
شجر ہے کوئی جس کے پھل پھول ہو تم

وہی ہے کہ ہر چیز جس سے بنی ہے
اوسی کی ہر اک سمت شادی رچی ہے

ہر اک دل میں اسکی لگن لگ رہی ہے
ہر اک جان کی جان بس اک وہی ہے

عناصر زمین کے فلک کے ستارے
اسی کے تو اخگر براتی ہیں سارے

امداد حسین اخگر مرادآبادی

غزل

قفس میں آرزو جینے کی ہم صیاد کیا کرتے
بڑھا کر اور اپنی قید کی میعاد کیا کرتے

فنا ہے اور شئے تبدیل ہئیت دوسری شئے ہے
وہ میری ایک مشت خاک کو برباد کیا کرتے

ہمارا ضبط تھا پابند آئین زباں بندی
لب خاموش کو آلودہ فریاد کیا کرتے

ہمیں تھی اُنسے امید وفا اور وہ وفا دشمن
انہیں ہم بھول کیوں جاتے ہمیں وہ یاد کیا کرتے

انہیں فرصت کہاں تھی دشت وحشت کے تماشے سے
ترے دیوانے سیر عالم ایجاد کیا کرتے

ہماری خاک کا ہر ذرہ دنیائے محبت ہے
ہمیں برباد بھی کرتے تو وہ برباد کیا کرتے

سنائی گریۂ خونیں میں انکو داستاں دل کی
بیاں ہم اس سے بہتر درد کی روداد کیا کرتے

طلسم بیخودی تھے نقش دنیائے محبت کے
ستم کش امتیاز راحت و بیداد کیا کرتے

فضا گونجی ہوئی ہے نغمۂ منصور سے اب تک
ترے دیوانے جو کچھ کر گئے آزاد کیا کرتے

مری آشفتہ حالی اک سزا تھی جرم الفت کی
وہ قید غم سے اے فرخ مجھے آزاد کیا کرتے

فرخ بنارسی

"جامِ کہن ——— اور ——— بادۂ نو"

بہلاؤں تا بہ کے دلِ آشفتہ سر کو میں
کب تک مٹاؤں رنج و الم کے اثر کو میں
حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں
شاید کچھ اس طرح میری تسکین ہو سکے

مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

حرماں نصیب دل کی تسلی کو کیا کروں
کب تک میں بزمِ ناز سے نا آشنا رہوں
چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں
لیکن یہ سادگی ہے کہ از راہِ امتحاں

ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

بے اختیاریوں پہ نہیں کوئی اختیار
اللہ رے اضطرابِ دلِ ناتوان و زار
جانا پڑا رقیب کے در تک ہزار بار
اور ایسے حال میں کہ نہیں طاقت و شکوں

اے کاش جانتا نہ ترے رہگذر کو میں

باطل کی شوخیوں سے نہ حق آشنا ڈرے
اک سر فروش قتل کی دھمکی سے کیا ڈرے
ہے کیا جو کس کے باندھیے میری بلا ڈرے
سمجھا ہے تم نے کیا مرے وہم و قیاس کو

کیا جانتا نہیں ہوں تمہاری کمر کو میں

اب دورِ عاشقی کا زمانہ تمام ہے
کہتے ہیں جس کو عشق وہ سودائے خام ہے
لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے
اللہ رے زر پرستیٔ دنیائے حسن و ناز

یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

پروانہ جیسے جاتا ہے شعلہ کی لو کے ساتھ
تاریکیوں کا دور چلے جیسے ضو کے ساتھ
چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک راہ رو کے ساتھ
صرف اس امید پہ کہ ملے کوئی غم گسار

پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

کم بخت جانتے ہی نہیں عشق کا وقار
اہلِ ہوس سمجھ نہ سکیں گے مرا شعار
خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار
یہ کم نگاہیاں ہیں تو کہنا پڑا مجھے

کیا پوچھتا ہوں اس بت بیداد گر کو میں

اب لغزش قدم پہ نہیں کوئی اختیار — جذبات ہوشیار، نہ احساس پائدار
پھر بیخودی میں بھول گیا راہ کوئے یار — اے وائے فرط شوق کی حرماں نصیبیاں
جاتا وگرنہ ایک دن اپنی خبر کو میں

ملتا نہیں کوئی مجھے مجھ جیسا مبتلا — اہل نظر کو ڈھونڈتا پھرتا ہوں جابجا
اپنے پہ کر رہا ہوں قیاس اہل دہر کا — میرا قصور ہے کہ بہ عنوان شاعری
سمجھا ہوں دلپذیر متاع ہنر کو میں

جویا اس آستاں کا ہے اکبر سر نیاز — محمود سے جدا رہے کب تک بھلا ایاز
غالب خدا کرے کہ سوار سمند ناز — صمصام حیدری کو نمایاں کئے ہوئے
دیکھوں علی بہادر عالی گہر کو میں

اکبر حیدری

غزل

منتشر شیرازۂ ہستی تو کیا ہو جائیگا — صرف وہ برہم نہ ہوں نالہ رسا ہو جائیگا
التفات ناز کیا صرف وفا ہو جائیگا! — دو گھڑی کو آ ہی جاؤ گے تو کیا ہو جائیگا؟
ان کے دل کی بات میری آرزو بنجائیگی — وہ جو سوچیں گے مقدر کا لکھا ہو جائیگا
آپ تو بیمار غم کا حال سنکر رو دئے — یہ نہ سوچا کوئی سن لیگا تو کیا ہو جائیگا
حسن ہی خود بن گیا سرمایہ دار درد عشق — اب جفا کو بھی وفا کہنا روا ہو جائیگا
وہ تاسف کیوں کریں سنکر کسی کا حال زار — اس سے تو درد دل شاید سوا ہو جائیگا
یک بیک طالب گھٹائیں سی خرد پر چھا گئیں
سوچتا یہ تھا کہ کوئی اور کیا ہو جائیگا؟

طالب باغپتی

"تو ایسے سمے میں آ پیاری!"

دنیا کی فضائیں سب چپ ہیں! جنگل کی ہوائیں سب چپ ہیں!
چڑیوں کی صدائیں سب چپ ہیں! آ پریت کے گیت سنا پیاری!
تو ایسے سمے میں آ پیاری!

غم کی گھٹا ہے گھر کر آئی یاس نے دل پر چھاؤنی چھائی
میں ہوں اور میری تنہائی اس تنہائی کو مٹا پیاری!
تو ایسے سمے میں آ پیاری!

پچھلے پہر کی خاموشی ہے فطرت غرق مدہوشی ہے
اک عالم سکر فروشی ہے آ سینے میں اتر آ پیاری!
تو ایسے سمے میں آ پیاری!

کلیوں پہ تتلی منڈلاتی ہے! اور پریت کے گیت سناتی ہے!
پچھلی کہانی یاد آتی ہے! آ پھر وہی رنگ دکھا پیاری!
تو ایسے سمے میں آ پیاری!

گھنگھور گھٹائیں چھاتی ہوں! سرمست ہوائیں آتی ہوں!
چڑیاں گیت سناتی ہوں! سبزے کا ہو فرش بچھا پیاری!
تو ایسے سمے میں آ پیاری!

دنیا ساری خوابیدہ ہے! اور فطرت آرامیدہ ہے!
بیدار نظر رنجیدہ ہے! سپنا بن کے سما جا پیاری!
تو ایسے سمے میں آجا پیاری!

وادی کے نظارے سامنے ہیں! دریا کے کنارے سامنے ہیں!
خوشرنگ ستارے سامنے ہیں! اک جھلک دکھلا جا پیاری!

تو ایسے سمے میں آ پیاری!

دل میں بر پا محشرِ غم ہے! روح پہ طاری سیلِ الم ہے
اختر کی آنکھوں میں نم ہے! سب کچھ دل سے بھلا جا پیاری
تو ایسے سمے میں آجا پیاری!

اختر شیرانی

افکارِ انجم

چشمِ حیرت سے دیکھتے ہیں تجھے اے انساں! بری بلا ہے تو!
کرمِ بے مایہ تھا تو ہی کل تک آج دیکھے کوئی کہ کیا ہے تو!

کونسی شئے سے تو نہ ڈرتا تھا؟ کونسی شئے نہ تھی تری مسجود؟
عہدِ طفلی میں بے خبر تھا تو کہ تری ذات کا ہے کیا مقصود؟

آج تیرے شعور کا عالم محوِ حیرت کئے ہے عالم کو؟
اب ہوا کائنات کو معلوم کیا بلا دی گئی تھی آدم کو!

تیری وسعت کے ممکنات کا ہم رات بھر ذکر کرتے رہتے ہیں
سچ تو یہ ہے کہ دسترس سے ترے دل میں ہم خود بھی ڈرتے رہتے ہیں

دیو فطرت تو ہو چکا بسمل اب زمان و مکاں کی باری ہے
جسکی زد میں ہیں آسمان و زمین تو ہی لاریب وہ شکاری ہے

امین حزیں

حسن زار کشمیر کی ایک صبح

سحر نے چاک کیا جب کہ رات کا دامن
جہاں کا چہرۂ بے نور ہو گیا روشن

ہوا وہ پھیکا سحر شمع جھلملانے لگی
وہ دیکھو ہو گئے دھندلے کواکب روشن

عروس صبح وہ گھونگھٹ میں مسکرانے لگی
اٹھا دی بڑھ کے دھندلکے نے رات کی چلمن

وہ موج آب مچلتی ہوئی بڑھی آگے
دکھا رہی ہے زمانے کو بجلیوں کے چلن

وہ دیکھو بزم میں دریا کے اک تلاطم ہے
نہانے آئی ہے خورشید کی وہ پہلی کرن

حسین ہیرۂ آبی جو جگمگانے لگا
شعاع مہر نے خود بڑھ کے ڈال دی چلمن

سوائے نور کے اب کچھ نظر نہیں آتا
کہ بن گیا ہے ہیولائے برق کا مسکن

نقاب اٹھتے ہی خورشید کی چمک اٹھّا
ہر ایک قطرۂ شبنم مثال دُرِّ عدن

بچھی ہے صحن میں سبزے کی مخملی چادر
کھڑے ہیں سب وہ قطاروں میں گلرخان چمن

وہ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں وہ بھینی بھینی مہک
مشام جاں کو معطّر کئے ہے بوئے چمن!

چمک سے مہر درخشاں کے صحن گلشن میں
ہر ایک قطرۂ شبنم ہے گوہر روشن

نسیم صبح کے جھونکوں کی وہ دلاویزی
وہ سبزہ زار کی لہریں وہ رنگ و بوئے چمن

وہ گدگدایا نسیم سحر نے کلیوں کو
وہ کھلکھلا پڑا ہر اک چمن کا غنچہ دہن

ہر ایک طائر خوش رنگ چہچہا اٹھّا
عجیب رنگ پہ آئی ہے آج بزم چمن

ہر ایک غنچہ چٹک کر ہوا ترنم خیز
وہ دیکھو چھڑ گیا اب ساز اہل بزم چمن

ہر ایک پنکھڑی پھولوں کی مست ہونے لگی
وہ جھومنے لگے ہر سمت حوشان چمن

صدا وہ آنے لگی حمد کے ترانوں کی
اٹھا وہ صحن گلستاں سے نغمۂ گلشن

عجیب بجلیاں پرتو نے صبح کی بھر دیں
کسی کے روکے سے رکتا نہیں ہے جوش چمن

ہم وہ برگ شجر نے بھی مل کے چھیڑا ساز
ہر ایک شاخ ہوئی گل کی صورت معدن

صدائے بربط و چنگ و رباب آنے لگی
نوائے زمزمہ سنجی سے گونج اٹھا گلشن

ہر ایک شاخ بھی پھولی نہیں سماتی ہے
ہے کھنچ کے آیا یہاں تک بہارِ گلشن

کہ اُڑ نہ جائے کہیں پھر یہ بزمِ گلشن سے
نسیمِ صبح ہے تھامے شمیم کا دامن

بیاں ہو کس طرح تفصیل مختصر یہ ہے
بنا ہے تختۂ فردوس تختۂ گلشن

سحر کی ادنیٰ سی محمود یہ تجلّی ہے
کہ جس نے منظرِ عالم کو کر دیا روشن

محمود الہ آبادی

غزل

حسن مشتاقِ وجودِ دیدۂ بینا ہوا
عشق محوِ انتظارِ لذتِ فردا ہوا

آرہا ہوں بزمِ فطرت کا تماشا دیکھ کر
ہر نفس میرا ابھی ہے کیف میں ڈوبا ہوا

فطرتِ مجبور تعمیل ادا مر کیا کرے
ایک دل حصے میں آیا وہ بھی ہے سہما ہوا

ذرّہ ذرّہ بنگیا دل، عشق کی تاثیر سے
کوئی دیوانہ ترا جب واردِ صحرا ہوا

صبحدم اٹھے ہیں لیکر دلمیں ہم داغِ جنوں
چاہیئے خورشید کو نکلے ذرا ابھرا ہوا

اپنے سایہ سے بھی رم کرنے لگے اہلِ جنوں
اپنی ہستی پر انہیں جب غیر کا دھوکا ہوا

اللہ اللہ ابتسامِ حسن کا حسنِ کمال
ایک موجِ نور میں دل ہے مرا ڈوبا ہوا

وہ نگاہ جذب اٹھی جب کبھی میری طرف
عرصۂ ہستی میں پیدا ایک سناٹا ہوا

ارتقائے عشق ہے تمہیدِ تکمیلِ جنوں
اس سے آگے بڑھ گیا تو قیس خود لیلیٰ ہوا

دیکھتا ہوں میں بھی حافظ حسبِ ارشادِ جگر
منظرِ فطرت کو دل تھامے ہوئے سہما ہوا

حافظ غازیپوری

باب الاستفسار

عہد اسلام اور علم نجوم و فلکیات

(جناب سید محمد ارتضا صاحب۔ مدراس)

غالباً آپ کو معلوم ہوگا کہ دکن و جوار دکن کے بعض مقامات میں جوتش اور علم نجوم کے جاننے والے بکثرت پائے جاتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے بعض اپنے فن میں کامل بھی ہیں، ماضی کے حالات بڑی حد تک صحیح بتاتے ہیں، اس لئے لوگوں کو اپنے مستقبل کے متعلق بھی ان کی پیشین گوئی پر اعتبار آجاتا ہے۔ لیکن یہ سب غیر مسلم ہیں، مجھے بھی یہاں عرصہ تک قیام کرنے کی وجہ سے کچھ دلچسپی اس فن سے ہوگئی ہے۔ اور اردو کی ان مشہور کتابوں کا بھی مطالعہ کیا ہے جو بازار میں مل سکتی ہیں۔ میں ایک کتاب مرتب کر رہا ہوں جسمیں علم نجوم اور فلکیات کی تاریخی حیثیت سے بھی بحث کرنا ضروری ہے اس لئے براہ کرم مطلع فرمائیے کہ مسلمانوں میں کب سے ان فنون کا رواج ہوا، ان کے کیا کیا خاص کارنامے ہیں، پھر یہ بھی بتائیے کہ علم نجوم کے ذریعہ سے جو احکام صادر کئے جاتے ہیں وہ کیوں اور کس حد تک قابل اعتبار ہو سکتے ہیں۔ فلکیات اور نجوم میں باہم کیا علمی رابطہ ہو سکتا ہے۔

(نگار) آپ کا استفسار بحث کے مختلف پہلو پیش کرتا ہے اور غالباً یہ مشکل ہے کہ باب الاستفسار کے محدود و متعین صفحات میں تمام پہلوؤں پر علیحدہ علیحدہ گفتگو کرسکوں۔ بہر حال تعمیل ارشاد کرتا ہوں اور مختصراً جتنی روشنی ان مسایل پر ڈالی جاسکتی ہے، اسکو بیک وقت پیش کرنیکی کوشش کرونگا۔

فضا اور کواکب و نجوم سے دو علم متعلق ہیں جنمیں سے ہر ایک کا موضوع بالکل جداگانہ ہے۔ ایک وہ جسے علم نجوم یا علم احکام نجوم یا علم تنجیم کہتے ہیں اور دوسرا وہ جو ہیئت یا فلکیات کے نام سے موسوم ہے۔ پہلے کا مقصود گردش کواکب کو دیکھ کر پیشین گوئی کرنا ہے اور دوسرے کا صرف اجرام فلکی کے متعلق علمی تحقیق و جستجو۔

علم تنجیم کو ارسطو نے علوم طبیعیہ کی شاخ قرار دیا ہے لیکن فارابی اور ابن خلدون وغیرہ نے اسکو علوم ریاضیہ میں شامل کیا ہے۔ میرے نزدیک علم التنجیم کا جس حد تک تعلق ہیئت سے ہے اُسے ریاضی کی شاخ سمجھنا چاہئے

اور احکامات صادر کرنے کا حصہ اُن علوم طبیعیہ سے وابستہ ہے جنمیں علم الفراست (قیافہ) علم الکیمیا اور علم تعبیر الرؤیا وغیرہ داخل ہیں۔

علم تنجیم کی بنیاد اس اعتقاد پر قایم ہے کہ تمام تغیرات "عالم کون و فساد" کے اجرام فلکی کی گردش سے وابستہ ہیں اور اس سلسلہ میں جس قدر اصطلاحات مرتب ہوگئی ہیں اور جن کا علم آپ کو ہونا چاہئے، ان سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے دیگر علوم و فنون کی طرح اس طرف بھی خاص توجہ کی اور ہیئت کی بہت سی اصطلاحات کی طرح، علم نجوم کے بھی تمام اصطلاحات یورپین لٹریچر میں انہیں سے لئے گئے۔ مسلم ماہرین علم نجوم نے زیادہ تر ان تین باتوں کی طرف توجہ کی۔ اول۔ روزانہ واقعات زندگی کے متعلق سوالات کا جواب دینا۔ مثلاً یہ کہ فلاں چیز ملے گی یا نہیں، فلاں شخص کہاں غایب ہوگیا ہے، فلاں چور پکڑا جاسکے گا یا نہیں وغیرہ وغیرہ اس کا اصطلاحی نام "مسایل" ہے۔ دوسرے کسی کام کرنے کے لئے نیک ساعت بتانا جسے اصطلاح میں "اختیارات" کہتے ہیں۔ تیسرے زائچہ طیار کرنا جس سے کسی شخص نومولود، یا قوم کے ماضی و مستقبل کے حالات معلوم ہوسکیں جسے اصطلاح میں "تحویل سن الموالید" یا "تحویل سن العالم" کہتے ہیں۔

عرب کے مسلمانوں نے اس فن کو مختلف ذرایع سے حاصل کیا، یونانی ذرایع میں سے افلاطون، ویتیس ویلنس (Vettius Valens) ڈروتھیس سڈونس (Dorotheus Sidonius) تیوسر (Teucer)، انتیاکوس (Antiochus) مخصوص طور پر قابل ذکر ہیں۔ علاوہ یونانی ذرایعہ کے پہلوی اور ہندی کتابوں سے بھی انھوں نے مدد لی اور مصر، عراق اور شام میں جو زبانی روایات اس فن کے متعلق چلی آرہی تھیں ان سے بھی فایدہ اٹھایا۔ الغرض مسلمانوں کا علم تنجیم ان سب کا امتزاج تھا جو نہایت مکمل طریقہ سے ابو معشر کی تصانیف میں پایا جاتا ہے۔

فلاسفہ و فقہاء وغیرہ نے سوائے الکندری، فخر الدین رازی اور اخوان الصفا کے ہمیشہ اس علم کی مخالفت کی، لیکن عملاً یہ مخالفت بیکار ثابت ہوئی اور تمام خلفاء و امراء کے دربار میں اہل تنجیم کا باثر ہونا تاریخ سے ثابت ہے۔

اس فن میں ابو معشر کی مشہور تصانیف کے علاوہ الکندری کے رسایل جنمیں اسلام کا زائچہ طیار کیا گیا تھا، علی بن رضوان کی شرح افلاطون کی کتاب پر، احمد بن یوسف کی شرح کتاب الثمرہ پر، ابوالحسن علی بن ابی رجال کی تصانیف، سہل بن بشر ابوبکر الحسن بن الخصیب، ابو علی یحییٰ بن الخیاط، محمد بن عمر بن الفرخان الطبری، کی کتابیں جنکے ترجمے پہلے لاطینی زبان میں اور پھر یوروپ کی دوسری زبانوں میں ہوکر مشہور ہو چکے ہیں۔ اس فن میں مسلمانوں کے مشہور علمی کارنامے یہ ہیں

علم الافلاک یا علم ہیئت میں مسلمانوں کی کاوشیں بہت زیادہ قابل قدر ہیں، یوں تو اہل عرب ظہور اسلام سے قبل ہی ہیئت کا کچھ نہ کچھ عملی علم رکھتے تھے جسے اُن کی صحرائی زندگی اور بدویانہ طرز معاشرت نے مجبور سکھا دیا تھا (کیونکہ رات کی سیاحتوں نے جنکا وہاں بہت زیادہ رواج تھا، انہیں بتا دیا تھا کہ چاند اور ستاروں کی جائے وقوع اور اوقات طلوع اور غروب سے وقت اور موسم کا حال معلوم کر لیا کریں) لیکن علمی حیثیت سے اس کا رواج دوسری صدی ہجری میں ہوا اور اس کی ابتدا سنسکرت کی ان کتابوں سے ہوئی جو ۱۵۴ھ میں دربار خلافت تک پہونچیں۔ یہ کتابیں برہما گپتا

کی تھیں اور انہیں کو پیش نظر رکھکر، ابراہیم حبیب الفزاری اور یعقوب بن طارق، نے عربی میں اس فن کی کتابیں مرتب کیں اور ابوالحسن اہوازی نے گردش سیارگان کا نقشہ بنایا۔ ان کتابوں میں جس اصول پر نقشے دئے گئے تھے اسکا نام انہوں نے السندہند رکھا، جو یقیناً سنسکرت لفظ سدھانتا کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔ یہ اصول تقریباً پانچویں صدی ہجری تک قائم رہا۔

اس کے بعد پہلوی کتابوں اور نقشوں سے مدد لی گئی چنانچہ عربی کا زیج شاہ یا زیج شہریار پہلوی نقشہ زیک شترو۔ ایار ہی کا مترادف ہے جو ساسانی حکومت کے زمانے میں طیار ہوا تھا۔ تیسری صدی ہجری میں مسلمان ہیئت داں اس زیج کے زیادہ مائل تھے لیکن اس کے بعد اسکا رواج ختم ہوگیا۔

ہیئت میں یونانی اثر کو مسلمانوں نے بہت بعد میں قبول کیا لیکن حد درجہ استحکام کے ساتھ سب سے پہلے بطلیموس (Almagest) کا ترجمہ، المجسطی کے نام سے ہوا، جو زیادہ کامیاب چیز نہیں کہی جا سکتی لیکن اسکے بعد حجاج بن مطر اور حنین بن اسحاق نے زیادہ بہتر صورت میں اس خدمت کو انجام دیا۔ اس سلسلہ میں اور بعض مشہور یونانی ہیئت دانوں کی کتابوں کا ترجمہ کیا گیا۔

باقاعدہ رصد گاہوں کے استعمال کی ابتدا جندیشاپور میں (جو ایران کے جنوب و مغرب کا ایک مقام ہے) ہوئی اور احمد النہاوندی نے اپنی مشہور زیج المشتمل طیار کرنیکے زمانہ میں آلات رصدگاہ کا استعمال کیا۔

مامون الرشید عباسی کے زمانہ میں مسلمانوں کی ترقی اس فن میں اپنے عروج پر تھی۔ بغداد کی رصدگاہ میں یحییٰ بن ابی منصور کی نگرانی میں دربار خلافت کے ہیئت دانوں نے باقاعدہ گردش اجرام کا معائنہ کیا، المجسطی کے تمام اصول کی عملی تصدیق کی اور بہت سے مسائل ہیئت عملی طور پر حل کئے اور الزیج الممتحن طیار کیا جس کی تصدیق کوہ قاسیان کی رصدگاہ سے بھی کی گئی۔ عہد مامون الرشید میں تدمر اور الرقہ کے درمیان دائرہ نصف النہار کے ایک درجہ کی پیمائش ایک مشہور واقعہ ہے۔ عہد مامون میں محمد بن موسیٰ الخوارزمی بھی نہایت مشہور ہیئت داں ہوا جس کی زیج دو صدی تک رائج رہی۔

۸۵۰ء سے ۸۷۰ء تک موسیٰ بن شاکر کے تین بیٹوں نے خود اپنے گھر پر رصدگاہ قائم کر کے ہیئت کا مطالعہ کیا۔ اسی صدی میں شیراز، نیشاپور، سمرقند وغیرہ میں بھی رصدگاہوں سے کام لیا گیا۔ تیسری صدی ہجری میں ثابت بن قرہ البتانی، الماہانی، النائریزی وغیرہ مشہور ہیئت داں گذرے ہیں۔

سلاطین بویہ کے زمانہ میں بھی ایک رصدگاہ قائم ہوئی اور عبدالرحمان الصوفی، ابن الاعلم، ویجن بن رستم الکوہی، احمد الصاغانی اور ابوالوفا وغیرہ بڑے بڑے ہیئت داں دربار میں جمع ہوگئے۔ اسی زمانہ میں غزنہ میں البیرونی ہوا جس کے کارنامے کافی مشہور ہیں۔

مصر میں باقاعدہ مطالعہ ہیئت فاطمی خلیفہ العزیز کے زمانہ میں شروع ہو۔ اس خلیفہ نے قاہرہ میں ایک رصدگاہ قائم کی اور جائداد اس کے متعلق وقف کی گئی۔ اسی رصدگاہ میں ابن یونس نے اپنا مشہور "الزیج الحاکمی" طیار کیا۔ اسپین میں دسویں

صدی عیسوی کے وسط سے اس طرف توجہ ہوئی اور شاہزادگان قرطبہ، اشبیلیہ، اور طالیدہ نے بھی اس جانب اعتناء کیا یہاں جو تصانیف ہوئیں وہ پہلے اسپینی زبان میں اور پھر لاطینی میں منتقل ہوئیں۔ یہاں کے مشہور ہیئت داں مسلمۃ المجریطی، ابن السمح، جابر ابن افلح، اور الزرقالی تھے۔ شمالی افریقہ میں ہر چند کوئی باقاعدہ رصدگاہ قایم نہیں ہوئی تاہم بعض ہیئت داں وہاں ایسے پیدا ہوئے جن کا نام تاریخ میں پایا جاتا ہے اور جنمیں ابو علی الحسن المراکشی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

شمالی ایران میں سلجوقیوں کا دربار بھی اس علم کے ماہرین سے خالی نہ تھا چنانچہ جلال الدین ملک شاہ سلجوقی کے زمانے میں بمقام نیشاپور رصدگاہ قایم ہوئی اور اسکے بعد الخزائنی نے زیج سنجری طیار کی۔

الک خانی خاندان کی مشہور خونریز وخون آشام ہستی ہلاکو نے بھی مراغہ میں ایک بڑی رصدگاہ نصیر الدین طوسی کی نگرانی میں طیار کرائی۔

علامہ طوسی نے بارہ سال کے مطالعہ کے بعد زیج الکنعانی شایع کی۔ طوسی کا ایک شاگرد قطب الدین محمود الشیرازی بھی خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

قاہرہ میں ایک شخص ابن الشاطر بڑا ماہر فلکیات پیدا ہوا جس کے مرتب کئے ہوئے زایچے شام، مصر، اور تمام شمالی افریقہ میں رائج ہوے۔

تیمور کے پوتے سلطان الغ بیگ نے سمرقند میں ایک بہت بڑی رصدگاہ تعمیر کرائی۔ جسمیں جمشید الکاشی، قاضی زادہ، الرومی، اور علی القوشجی ایسے مشہور ماہرین فن مامور کئے گئے اور خود سلطان الغ بیگ نے کئی سال تک رصدگاہ کی صدارت کی مگر افسوس ہے کہ الغ بیگ کے ساتھ ہی اسلامی دنیاے ہیئت کی اصلی شان مٹ گئی اور اسکے بعد صرف جنتریاں بنانے والے، اور اوقات نماز بتانے والے لوگ رہ گئے۔

مسلمان ہیئت دانوں نے تقریباً بطلیموس کا تتبع کیا اور زمین کو ساکن مانکر، دیگر اجرام فلکی کی گردش کو دائرہ دار تسلیم کیا۔ البتہ اسپین کے بعض فلاسفہ نے نظام بطلیموسی کی مخالفت کی۔ ان میں سب سے پہلا محمد بن یحییٰ تھا جو ابن باجہ کے نام سے مشہور ہے۔ ابن طفیل نے بطلیموس اور ابن باجہ دونوں کی مخالفت کی۔ ابن رشد نے حرکت اجرام کو لولبی (Homocentric) تسلیم کیا۔

الغرض مسلمانوں کے کارنامے علم ہیئت میں دیگر علوم ریاضیہ کی طرح کم نہیں ہیں اور یورپ کا بہت سا علمی ذخیرہ فلکیات کے متعلق مسلمانوں ہی کی کتابوں کا ترجمہ ہے۔

اب آپ کے سوال کا ایک جزو رہگیا، اور وہ یہ کہ آیا ہماری زندگی اور معاملات زندگی پر اجرام فلکی کا کوئی اثر ہوتا ہے یا نہیں، سو اس کا جہاں تک علمی تعلق ہے، انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ حوادث طبیعی کا تعلق زیادہ تر گردش سیارگان ہی سے ہے اور اب جبکہ فضا کی شعاعوں کے اثرات بداہتہً ثابت ہوتے جا رہے ہیں۔ اس سے کون انکار

کتا ہے کہ اہل زمین کی صحت و بیماری، ترقی و تنزل کا تعلق قضا و رمانی الفضا سے نہیں لیکن کسی کا یہ خیال کر لینا کہ جو کچھ کرتے ہیں اجرام رتے ہیں بیشک لغو و مہمل ہے اور اسی خیال سے مذہب نے اہل نجوم کی پیشین گوئیوں کے خلاف احتجاج کیا۔ البتہ ان کو اگر بجائے فاعل دلایل و ذرائع مان لیا جائے تو کوئی حرج نہیں اور بڑی حد تک حقیقت سے بھی قریب ہے

پر اسرار لوح کا انکشاف

جکل طب یونانی کی بڑی شدومد سے مخالفت ہو رہی ہے جو لوگ اسکے کرشمے سے ناواقف ہیں وہ ذیل کے مضمون کا مطالعہ کریں جو رسالہ الحکیم سے پبلک کے فائدہ اور اطلاع کیلئے اقتباس کیا گیا ہے۔ رنگون کے ایک صاحب ثروت سوداگر اسباب معلومہ کی وجہ سے .... نوذی کا شکار ہو کر بالکل ...... ہو گئے تھے۔ مدت تک مشہور معروف اطباء کا علاج کرایا سب منشاء فائدہ نہ ہوا۔ یہ قاعدہ ہے کہ مایوس العلاج مریض ذلیل سے ذلیل طریقہ علاج کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ انہوں نے بھی عطائیوں ناڑیوں سب سے ہی رجوع کیا اور آخر میں ناکامیاب رہنے پر یہ قصد کر لیا کہ ہندوستان کے تمام مشہور مقابر پر جاکر دعائیں مانگیں اور دوران سفر میں ر طبیب ملنے لگے ہاتھ اس سے بھی رجوع کریں۔ وہ اپنے اسی دورہ پر تھے کہ اتفاقاً درگاہ حضرت محبوب الٰہی کی درگاہ میں مجھ سے شناسائی و اور یہ معلوم ہونے پر کہ میں طبیب ہوں اپنا حال مجھے سنا دیا اور ٹھنڈی سانس بھر کر چپ ہو رہے۔ مجھ پر انکے طرز بیان کا کچھ ایسا اثر ہوا کہ فوراً ج کرنے کا وعدہ کر لیا۔ چنانچہ میں نے ان کا علاج نہایت محنت و جانفشانی سے شروع کیا لیکن کوئی فائدہ مرتب نہ ہوا۔ قریب تھا کہ وہ بددل ہو کر چلے جائیں کہ حسن اتفاق سے ایک دوست کی زبانی معلوم ہوا کہ گوڑگانوہ میں کوئی نذیر احمد صاحب ہیں جن کے پاس اس مرض کا نادر نسخہ ہے لیکن نہ وہ طبیب ہیں نہ صاحب غرض بلکہ گھر کے رئیس اور کھاتے پیتے ہیں۔ نسخہ کسی کو نہیں بتلاتے۔ البتہ اگر کوئی زبردست سفارش لے کر چ جائے تو دوا تیار کر دیتے ہیں۔ اس قدر تعریف سن کر میں ایک تعارفی خط لے کر سیدھا گوڑگانوہ پہونچا وہ بہت اخلاق سے پیش آئے اور دوا مجھے دی۔ میں نے سیٹھ صاحب پر اسکا استعمال شروع۔ سیٹھ صاحب کی قوت حیرت انگیز طور پر ترقی کر گئی اور اسقدر طاقت پیدا ہوئی کہ ن سے باہر ہے، اور میں نے اس کو متعدد مریضوں پر مختلف حالات میں آزمایا پر بھی ہمیشہ تیر بہدف پایا یقیناً میرے علم میں ایسا پر اثر نسخہ کسی دوسرے کے پاس نہیں ہے۔ مجھے صرف اتنا معلوم ہو سکا کہ یہ نسخہ بو علی سینا کی خاص دماغی کوششوں کا نتیجہ ہے جو کسی بادشاہ کے لئے تجویز کیا گیا تھا ب معدنی لوح پر کندہ ہے وہ اس نسخہ سے کوئی فائدہ نہیں اٹھاتے اس لئے میری یہ استدعا بیجا نہ ہوگی کہ ایسے صاحب کمال کے اس نسخہ کو کیم میں شایع کر کے تمام اطباء ہند کو شکریہ کا موقعہ دیں۔

خادم الاطباء مسعود الرحمٰن

اڈیٹر صاحب الحکیم کا نوٹ

یہ مکتوب کوئی دو تین ماہ ہوئے ہمارے پاس پہونچا تھا لیکن اشاعت سے قبل ہمنے ان واقعات کی مزید تحقیق کے لئے اپنے کرم فرما خان بہادر سردار علی صاحب کو تکلیف دی جو حسن اتفاق سے آجکل گوڑگانوہ میں قیام پذیر ہیں چنانچہ صاحب موصوف کا جو جواب ہمیں موصول ہوا ہے وہ درج ہے:۔ مکرمی جناب حکیم صاحب السلام علیکم میں کل نذیر احمد قریشی سے ملا تھا وہ حکیم نہیں ہیں۔ مولوی برکت علی صاحب وکیل لاہوری فرزند ہیں ان کے پاس قوت باہ کا واقعی ایک عجیب نسخہ ہے۔ تابعدار سردار علی سپرنٹنڈنٹ پولیس مارچ ۲۹ء عن

ٹ:۔ یہ دوا پبلک کی فرمایش سے بارہا تیار ہو چکی ہے۔ چونکہ اس نسخہ کے اجزا بہت مشکل سے فراہم ہوتے ہیں اس لئے اس دفعہ بھی صر و اشخاص کے لئے دوا تیار کی جا رہی ہے۔ جس میں سے بہت سے نام رجسٹر ہو چکے ہیں۔ ضرورت مند اصحاب قیمت دوا جلد روانہ کر کے اپنا جسٹر کرا لیں۔

قیمت:۔ اکسیر سینا سات روپیہ طلاء سینا تین روپیہ محصول ڈاک چھ آنے (۶)

پتہ:۔ نذیر احمد قریشی صیغہ (د) برکت منزل۔ گوڑگانوہ (پنجاب)

اقتباسات علمیہ

اجرام فلکی تک پرواز کا امکان

آپ ایک انڈا لیجئے اور اس کے سرے پر ایک سوراخ کر دیجئے، اسی طرح اس کے نیچے دو سوراخ چھوٹے کیجئے جنمیں ایک کچھ بڑا ہو، زردی سفیدی نکال کر نصف حصہ پانی سے بھر دیجئے۔ اور ایک سوراخ بند کر دیجئے۔ اس کے بعد ایک ٹکڑا لکڑی کا لیکر اس میں چار کیلیں گاڑ دیجئے اور انڈے کو اسپر اس طرح رکھئے کہ ایک انچ لکڑی کی سطح سے بلند رہے، پھر اس کے نیچے ایک موم بتی روشن کر کے پانی کے حوض میں چھوڑ دیجئے، تھوڑی دیر نہ گذریگی کہ لکڑی کا ٹکڑا ایک کشتی کی طرح چلنے لگے گا۔ اسکی علمی توجیہ یہ ہے کہ پانی کا ایک حصہ گرمی کی وجہ سے بخار میں تبدیل ہوتا ہے اور چونکہ انڈے کا چھلکا اوپر کی طرف سے روکتا ہے اس لئے صرف چھوٹا سوراخ نکلنے کے لئے رہجاتا ہے اور جب بھاپ اس سے قوت کیساتھ نکلتی ہے تو لکڑی کو جہت مخالف کی طرف پھینکتی ہے۔

بالکل اسی اصول پر جرمنی کے ایک پروفیسر نے موٹر اور ہوائی جہاز کے اختراع کا دعویٰ کیا ہے جس کے اندر کی ہوائیاں یکے بعد دیگرے چھوٹتی ہوئی موٹر یا ہوائی جہاز کو آگے کی طرف پھینکتی جائیں گی اور یہ رفتار بندوق کی گولی کی طرح تیز ہوگی۔

مثلاً اگر کوئی شخص چاند پر جانا چاہے تو اسکی صرف یہی صورت ہوسکتی ہے کہ وہ توپ کے گولے کی طرح زمین سے جدا ہو کر بلند ہو اور یہ اسی طریقہ سے ممکن ہے جو جرمنی کے اس پروفیسر نے بتائی ہے۔ ہرچند اس وقت تک کوئی قابل ذکر کامیابی اس تجویز میں نہیں ہوئی، لیکن اس کو ناممکن العمل نہیں بتایا۔ کیونکہ اگر ۳۰ میل کی بلندی تک کوئی ہوائی جہاز پہونچ جائے تو وہ اتنی ہی قوت کے ساتھ جو سطح بحر سے قریب اسے استعمال کرنی پڑتی ہے، ایک گھنٹہ میں ۴۵۰۰ میل تک جاسکتا ہے۔ ہوا کا سمندر ۱۰۰ میل کا مانا جاتا ہے۔ اس سے عبور کرنے کے بعد ہی اگر کشش زمین ختم ہوگئی تو پھر کوئی جھگڑا ہی باقی نہ رہا، لیکن اگر وہ ختم نہ ہوئی تو بھی اس کا اس حد تک کم ہو جانا یقینی ہے کہ ہوائی جہاز کی رفتار بہت کم قوت کے ساتھ اس سے بھی دوچند ہوسکتی ہے، یہانتک کہ زمین کے حدود کشش ختم ہوں۔

بہرحال ماہرین فن اس مسئلہ پر غور کر رہے ہیں اور اس امر کا امکان پیدا ہوتا جاتا ہے کہ جب کسی وقت کرۂ ارضی پر تباہی آئے تو یہاں کے باشندے قبل ہلاک ہونے کے مریخ، زہرہ، یا مشتری وغیرہ جاکر اپنی نوآبادیاں قائم کرلیں اور زمین کے غیر آباد کرّے کو تباہ و برباد ہونے کے لئے نیچے چھوڑ جائیں۔

ایک عجیب و غریب عمل جراحی

انسان کے تمام اعضاء میں آنکھ کی ساخت جسقدر نازک و دقیق ہے اور کسی عضو کی

ں لئے اسپر عمل جراحی کرنا بھی آسان نہیں اور خاص طور سے مہارت حاصل کرنے کے بعد ڈاکٹر اسکی جرات کرتے ہیں۔ حال ہی میں
ریکہ کے ایک ڈاکٹر نے جو آنکھ اور کان کی بیماریوں کا ماہر ہے ایک عجیب و غریب عمل جراحی کیا

اس کے اسپتال میں ایک شخص آیا جس کی ایک آنکھ غایب تھی اور بجائے اس کے کانچ کی مصنوعی آنکھ لگی ہوئی تھی، دوسری
کھ میں بھی موتیا بند ہو گیا تھا۔ موتیا بند میں آنکھ کا قرنیہ بیکار ہو جاتا ہے۔ اس ڈاکٹر نے کوشش کی کہ دوسرے کی آنکھ کا صحیح و
سالم پردۂ قرنیہ لیکر اس کے بیکار قرنیہ کے بجائے لگا دے۔ چنانچہ وہ اس عمل جراحی میں کامیاب ہو گیا اور اسکی بینائی عود کر آئی

مریخ کی آبادی

بعد غروب آفتاب فضائے آسمانی پر ایک بڑا ستارہ سرخ رنگ کا نظر آتا ہے۔ اسی کو مریخ کہتے ہیں
جس کا مدار زمین کے مدار سے بہت زیادہ وسیع ہے۔ جس وقت زمین مریخ و آفتاب کے درمیان
جاتی ہے تو اس کو اصطلاح میں استقبال کہتے ہیں کیونکہ اس وقت ہمارے سامنے سطح مریخ کا وہ حصہ سامنے ہوتا ہے جسپر
فتاب کی روشنی پڑتی ہے۔ پھر چونکہ مریخ کا مدار آفتاب کے گرد بیضاوی دایرہ کا ہے اس لئے کبھی وہ زمین سے دور ہو جاتا
ہے اور کبھی نزدیک۔ چنانچہ ۱۹۲۴ء میں مریخ، زمین سے بہت زیادہ قریب آگیا تھا یعنی صرف ۳۴ ملین میل دور تھا۔ اور اس لئے
علمائے ہیئت نے اس موقع کو غنیمت جانکر نہایت اہتمام کے ساتھ رصد گاہوں میں اس مطالعہ کیا اور سب بالاتفاق اس
تیجہ پر پہونچے کہ مریخ کی سطح پر حیات کے آثار پائے جاتے ہیں۔ اب رہا یہ امر کہ یہاں کی آبادی کس قسم کی ہے اور باعتبار عقل و
ذہن کے کیا مرتبہ رکھتی ہے اس میں ضرور اختلاف ہے۔ ڈاکٹر بکرنگ کا قول ہے کہ سطح مریخ پر نہ صرف عاقل آبادی کا پایا جانا
بلکہ اسکا ہم سے تخاطب کرنے کی کوشش کرنا بھی ثابت ہوتا ہے۔ ڈاکٹر ایبٹ کا خیال ہے کہ مریخ میں صرف حیات نباتی
پائی جاتی ہے۔ رسل، ایٹکن اور فشر کا بیان ہے کہ مریخ میں صاحب عقل اور متمدن آبادی کا پایا جانا نہ خلاف عقل ہے نہ غیر مرجح
لیکن اس وقت تک کوئی علمی دلیل اس امر کی بابت نہیں ملی کہ نباتات و حیوانات سے زیادہ ترقی یافتہ آبادی وہاں
موجود ہے۔

اب جدید تحقیقات سے یہ امر ثابت ہوا ہے کہ مریخ کی فضا میں اور اسکی سطح پر حرارت، پانی اور آکسیجن پائے جاتے ہیں جو حیات
کے لئے لازم ہیں اور دوربین کے ذریعہ جو تصویریں مریخ کی حاصل کی گئی ہیں ان سے ثابت ہوتا ہے کہ اسباب حیات جو
اہل مریخ کے لئے لازم ہیں وہی ہیں جو اہل زمین کے لئے درکار ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر کوبلنٹز نے ایک نہایت ہی نازک آلہ
کی مدد سے دریافت کیا ہے کہ مریخ میں دوپہر کے قریب گرمی ۶۰ درجہ کی ہوتی ہے جو ہندوستان کے موسم سرما میں دوپہر
کو ہوتی ہے۔ اس سے پہلے خیال کیا جاتا تھا کہ وہاں درجۂ حرارت صفر سے اونچا نہیں ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کروڑوں میل
پر واقع ہونے والے سیارے کی حرارت کا صحیح علم کیونکر ہو سکا، سو اس کے لئے ایک خاص آلہ طیار کیا گیا تھا۔ یہ شیشہ کی ایک
نلکی ہے جس کے اندر کی ہوا نکال لی جاتی ہے اور اندر نہایت باریک تار پلاٹینم اور بسمتھ کے مکڑی کے جالے کی طرح داخل
کئے جاتے ہیں۔ جہاں یہ تار جاکر ملتے ہیں وہ نہایت ہی باریک گول تختیاں ہیں جہاں تار آنکھ سے نظر نہیں آتے بلکہ خوردبین

کی مدد سے نظر آتے ہیں۔ اس نلکی کی ایک جانب مسطح ہے اور اس کے درمیان میں ایک چھوٹا سا شفاف ڈھیرہ ہے جس وقت مریخ سے آنے والی شعاعیں اس پر پڑتی ہیں اور شفاف سے گزر کر معدنی الواح تک پہونچتی ہیں تو انہیں گرم کر دیتی ہیں اور اور اس گرمی کی کیفیت سے وہاں کے درجۂ حرارت کی تعین کیجاتی ہے۔

بعض کا خیال ہے کہ ہر چند دوپہر کے وقت وہاں درجۂ حرارت ۶۰ ہوتا ہے لیکن رات کو وہ انجمادی نقطہ تک پہونچ جاتا ہے اور اس لئے رات دن کی حرارت میں یہ فرق عظیم حیات انسانی کے لئے منافی ہے۔

بڑی دوربین سے جس وقت سطح مریخ کو دیکھا جاتا ہے تو اس کی سطح پر کچھ خطوط اور کچھ خشکی کے حصے نظر آتے ہیں۔ ایام سرما میں اس کے قطبین کا حصہ سفید نظر آتا ہے جو گرمی کے زمانہ میں بہت کم ہو جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ سفید حصہ برف ہے جو بعد کو گھل گھل کر پانی ہو جاتا ہے۔ خطوط کے متعلق خیال کیا گیا تھا کہ یہ نہریں ہیں جو کاشت کے لئے طیار کی گئی ہیں اور جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں کے لوگ بہت ترقی یافتہ ہیں، لیکن اب کہا جاتا ہے کہ جن خطوط کو نہر سمجھا جاتا تھا وہ حقیقتاً نباتات کا سبز حصہ ہے جو فصل خریف تک زردی مایل رنگ اختیار کر لیتا ہے۔

بہر حال یہ امر یقینی ہے کہ مریخ میں نباتات کا وجود ضرور پایا جاتا ہے اور چونکہ نباتات کے ساتھ عادتاً حیوانات کا پایا جانا بھی مسلّم ہے اس لئے بعض ماہرین فن نے یہ فیصلہ صادر کیا ہے کہ مریخ میں نہ صرف نباتات بلکہ حیوانات بھی پائے جاتے ہیں اور حرارت یا پانی اور آکسیجن جو لازمۂ حیات ہیں، وہاں پائے جاتے ہیں اب رہا یہ امر کہ حیوانات کا وجود کس حد تک حالت ارتقار میں پایا جاتا ہے اور کرۂ ارضی کے انسان کیطرح وہاں کسی عاقل مخلوق کا وجود پایا جاتا ہے یا نہیں، اس کا علم ابھی تک کوئی حاصل نہیں ہو سکا، لیکن اگر موجودہ دوربین کی قوت بڑھ جائے اور فوٹو میں جزئیات آسکیں تو کہا جا سکتا ہے کہ حقیقتاً وہاں کس قسم کی مخلوق آباد ہے اور اس نے کس حد تک ترقی کر لی ہے۔

اصلاح تقویم

امریکہ کی اکاڈیمی نے تجویز پیش کی ہے کہ موجودہ تقویم میں اصلاح ضروری ہے اور اس طرح وہ سال کو تیرہ مہینوں میں تقسیم کیا جائے اور مہینے کو ۲۸ دن میں۔ تیرھواں مہینہ جو بڑھایا گیا ہے وہ جون کے اخیری تیرہ دن اور جولائی کے ابتدائی پندرہ دنوں سے ملکر بنانا چاہیے۔ اس طرح ۳۶۴ دن پورے ہو جاتے ہیں۔ ایک دن سال میں عید نوروز کا قرار دیا جائے اور اُسے سال میں داخل نہ کیا جائے اس طرح پورے ۳۶۵ دن ہو جائینگے سنہ کبیسہ میں دو دن کی کمی کا حساب اس طرح کیا جائے کہ ایک دن عید نوروز کے علاوہ ایکدن کبیسہ کا نکالدیا جائے اور یہ دونوں سال کے شمار میں شامل نہ ہوں۔

حامد رضا خاں تبسم نظامی کا اب نگار سے کوئی تعلق نہیں رہا اور نمایندگی نگار کی خدمت سے انہیں بعض اسباب کی بنا پر معزول کر دیا گیا ہے۔ اسلئے آیندہ کوئی صاحب نگار کے متعلق انکو کوئی رقم نہ دیں، ورنہ دفتر ذمہ دار نہوگا۔ — **مینجر نگار**

محبت کے دو عمل

...اسفلی ہے ہر مذہب والا عامل بن سکتا ہے۔
عمل ۲ علوی صرف مسلمانوں کے لئے مخصوص ہے۔ کامل بیس سال کا تجربہ کبھی سر مو خطا نہیں کی۔ جب تلاش تھی ہزاروں روپیہ
...اس لئے میں خدا کو حاضر و ناظر سمجھ کر اور گواہ بنا کر بے کم و کاست قلیل ہدیہ پر انکا اعلان کرتا ہوں کہ امیر و غریب سب فائدہ
...ہیں جن بھائیوں کو میری گذارش پر اعتبار ہو اور ساتھ ہی ایک حلف نامہ اس اقرار کا ارسال کریں کہ اپنی ذات کے سوا کسی کو نہ بتلائینگے طلب کریں
عمل ۱۔ اس عمل کو پڑھنے میں پندرہ منٹ صرف ہوتے ہیں اسکا عامل ایک سال اسیر قابض رہتا ہے۔ دوسرے سال کیلئے دوبارہ
منٹ صرف کر کے پڑھنا ہوتا ہے۔ صرف تین منٹ میں تین مرتبہ پڑھکر مطلوب کو تابعدار بنایا جا سکتا ہے۔ ہدیہ پانچ روپیہ (صہ)
عمل ۲۔ یہ ایک آیۃ قرآنی ہے جو صرف ایک سطر کی اکتالیس سیاہ مرچوں پر اکتالیس بار پڑھی جاتی ہے اور مرچیں آگ میں جلائی
...ہیں۔ سات دن میں انشاء اللہ مطلوب مسخر ہو جائیگا۔ ہدیہ عار
عمل ۳۔ برائے ترقی روزگار عجیب و غریب عمل ہے۔ ہفتہ میں صرف چہار شنبہ کو پڑھا جاتا ہے پڑھنے میں آدھ گھنٹہ صرف ہوتا ہے۔
...کی برکت سے روزی روزگار میں اسقدر ترقی ہوتی ہے کہ اللہ کی قدرت کا کرشمہ نظر آتا ہے۔ یہ نذرانہ ہے۔ اگر روپیہ چار آنہ میں ادس
...پڑھنے کی اجازت لے سکتے ہیں۔ ہر سہ عملیات کے پڑھنے میں کسی قسم کا خطرہ نہ خوف نہ پرہیز نہ وقت نہ اپنے مکان سے کہیں باہر
...پڑتا ہے جو صاحب عمل نمبر ۱ و ۲ ایک ساتھ طلب فرمائیں گے ان سے ہدیہ صرف چھ روپیہ (للعہ) لیا جائیگا۔ اگر بذریعہ منی آرڈر روپیہ روانہ کریں
...محصولڈاک معاف بذریعہ رجسٹری یا وی۔ پی لفافے میں عمل روانہ کئے جاتے ہیں۔

فضل شاہ عامل چھتہ لال میاں دہلی

خاص رعایت یکم شعبان المعظم تا ۳۰ شوال المکرم ۱۳۴۷ھ

غریبوں کا قرآن

غربا میں تقسیم کرنے کیلئے بہترین ہشت مہری کلام مجید

اس کلام مجید کو حسب ذیل خوبیوں کے ساتھ چھاپا گیا ہے:۔
...نہایت خوشخط، عمدہ چھپائی، نفیس کاغذ بہت کم ہدیہ، ہر پارہ علیحدہ علیحدہ ہے ہر پارہ کی پہلی سطر کا قلم جلی ہے اور خوشنما گل بوٹوں سے مزین ہے۔
قلم جلی روشن اور نمایاں ہے، کاغذ عمدہ خوشنما سفید چکنا ہے، ہر منزل پر مکہ معظمہ مسجد اقصیٰ یعنے بیت المقدس کا نقشہ ہے جو صحت اور خوبصورتی میں بے مثل ہے آنحضرت
...ہر منزل بھی علیحدہ ہے اور بیل بوٹوں سے مزین ہے، مخارج حروف کا مفصل بیان درج ہے جسے بچوں کو سب سے پہلے پڑھانا چاہیے، دہلی کے
...صلی اللہ علیہ وسلم کا نسب نامہ مبارک حضرت آدم تک لکھا گیا ہے۔ صرف کثیر کیساتھ کار خیر سمجھ کر تیار کیا گیا ہے۔
...مشہور ائمہ حافظوں کی مہریں ثبت ہیں جنہوں نے اسکی صحت کی ہے یہ قرآن مجید کم استطاعت مسلمانوں کیلئے بڑی کوشش اور
...لڑکوں اور لڑکیوں کے پڑھانے کیلئے اور غریبوں میں تقسیم کرنے کیلئے بےنظیر ہے تقطیع ۲۰×۲۶ انچ ہے صرف یکم شعبان المعظم سے ۳۰ شوال تک خاص رعایت رکھی گئی ہے ہدیہ
...بیجلد ہے کے صرف عہ ہے دس جلد منگائیں تو لعہ کے علاوہ محصولڈاک
...مجلد یا بجائے ...

(حاشیہ:) رعایت ... سے ...
(حاشیہ:) مسلمان ... فائدہ اٹھائیں

... [illegible] دہلی کا عظیم الشان [illegible]

دو ترجمے والا خوشنما قرآن [illegible]

بر حاشیہ حضرت شاہ [illegible] صاحب تھانوی مصدقہ و نظر ثانی شدہ [illegible] [illegible]

خط کی پاکیزگی - الفاظ کی نشست - حروف کی موزونی [illegible] چھپائی [illegible] درجہ کی

اس شان کا کلام مجید آج تک آپ کی نظروں سے نہ گذرا ہوگا [illegible] ترجمہ حضرت مولانا شاہ [illegible] صاحب [illegible]

کا درج ہو جسکو مسلمانوں کے تمام فرقے مقبولیت کی نظر سے دیکھتے ہیں [illegible] ترجمہ حکیم الامۃ

مولانا شاہ اشرف علی صاحب تھانوی مدظلہ العالی کا ہے جو حاشیہ کے پہلے حصہ [illegible] بامحاورہ

میں بامحاورہ کیا گیا ہے - تمام محذوفات و متعلقات کو خط [illegible] ظاہر کیا گیا ہے [illegible]

زبان نشستہ مطالب قرآنی و مفہوم کو ایسی خوبی سے ادا کیا ہے کہ گویا [illegible]

درجہ قبولیت حاصل کر چکا ہے یہ ترجمہ [illegible] ایک جگہ ادبی چھپا ہے [illegible]

[illegible] تفسیر بیان القرآن [illegible] اضافہ کیا ہے اس لیے [illegible] ترجمہ [illegible]

ہے اور تفسیر [illegible] ترجمہ [illegible] بیان القرآن [illegible]

[illegible] قرآن شریف کا [illegible] قرآن شریف [illegible]

[illegible] آپ [illegible] ہیں -

[illegible] انسانی کوشش [illegible]

[illegible] پورے قرآن شریف میں ایک غلطی بھی نہیں [illegible]

[illegible]

یر تاب ۱۲؍
ر دہنی ۱۰؍

مولانا شرر مرحوم

جنید بغدادی عہ؍
ملکہ زنوبیہ ۳؍
قرۃ العین ۳؍
مخدرات ۴؍
جویائے حق للعہ
لعبت چین عہ؍
فاتح مفتوح ۸؍
بابک خرمی ۸؍
الفانسو ۱۲؍
ایام عرب ۶؍
قیس و لبنیٰ ۸؍
یوسف و نجمہ ۸؍
زوال بغداد ۸؍
مینا بازار ۸؍
مقدس نازنین ۸؍
رومتہ الکبریٰ ۸؍
فلپانا ۸؍
شوقین ملکہ ۸؍
منصور موہنا ۸؍
حسن انجلینا ۸؍
ملک العزیز ورجنا ۱۲؍
فردوس بریں ۸؍
حسن کا ڈاکو ۸؍
دربار حرام پور ۱۰؍
عیب دان دلہن عہ؍
بدر النساکی مصیبت ۴؍

میوۂ تلخ ۸؍
نیکی کا پھل عہ؍

شوق قدوائی مرحوم

ترانۂ شوق عہ؍
قاسم و زہرہ عہ؍
نیرنگ جمال ۴؍

میر ولی اللہ بی اے

بندگی ۶؍
کاس الکرام مے
لسان الغیب جلد اول مے
" دوم ۶؍
" سوم ۶؍
" چہارم ۶؍
نمکدان فصاحت عہ؍
بادۂ ناب عہ؍

ظفر عمر بی اے

چوروں کا کلب ۹؍
نیلی چھتری عہ؍
بہرام کی گرفتاری عہ؍

مولانا نیاز فتحپوری

گیتان جلی ۶؍
گہوارۂ تمدن ۶؍
نگارستان ۶؍
صحابیات ۶؍
تاریخ الدولتین عہ؍

سید سجاد حیدر بی اے

زہرا ۱۳؍
جلال الدین خوارزم شاہ عہ؍
خیالستان
ثالث بخیر

حکایات و احساسات ۴؍

دلچسپ تاریخی و جاسوسی ناول

سراب فیشن ۸؍
بالشوک شہزادی ۸؍
شہید وفا ۸؍
ممتاز بیگم ۸؍
شعلۂ رنگین ۸؍
محاصرۂ پیرس عہ؍
شیخ چلی عہ؍
بہادر ترک ۸؍
بہرام کی واپسی ۸؍
انقلاب فرانس ۸؍
حسن بنارس ۸؍
نظر آتی جاسوس ۸؍
ترکی حرم سرا ۸؍
جنگ طرابلس ۸؍
بہرام چور ۴؍
زر پرست ۴؍
گنجی کارانہ ۴؍
عبدالرحمن ناصر ۶؍
عروس مصر ۶؍
سیلاب خون ۸؍
کرشمہ ۸؍
وفادار دلہن ۸؍
طواف زمین عہ؍

سیاحت زمین ۴؍
سیاحت ۸؍
نازنین مراکش ۸؍
سمندر کی سیر ۶؍
اسرار بالشویزم ۴؍
روح لیلیٰ مے
امین تک ۸؍
حجاج بن یوسف ۴؍
یوسف پاشا ۸؍
انقلاب عثمانی ۴؍
نیلی چھتری ۴؍
بہرام کی آزادی ۱۲؍
بہرام کی گرفتاری عہ؍
بہرام کی سرگزشت عہ؍
پر اسرار قتل ۶؍

ادبی کتابیں

مکمل شرح دیوان غالب مے
بزم خیال عہ؍
مشاطۂ سخن عہ؍
انشار النسوان ۶؍
مکاتیب محسن الملک عہ؍
لیلیٰ مجنوں ڈراما ۸؍

مراثی

مراثی دبیر ۶؍
مراثی انیس للعہ
مراثی ضمیر عہ؍

مراثی مونس ۱۲؍
مراثی دلگیر ۱۲؍

تذکرۃ الشعرا

تذکرۂ حسینی ۱۲؍
گلشن ۱۰؍
سراپائے سخن عہ؍
سوانح نظیر اکبر آبادی عہ؍

دواوین فارسی

دیوان شمس تبریز عہ؍
کلیات عراقی ۱۲؍
دیوان حافظ عہ؍
دیوان نعمت خان عالی ۸؍
کلیات انوری ۶؍
دیوان بیدل ۱۰؍
کلیات سعدی عہ؍
دیوان عرفی ۱۲؍
کلیات جامی ۸؍
کلیات غالب ۵؍
کلیات صائب ۱۲؍
کلیات حزیں ۶؍
دیوان عنصری ۱۴؍
دیوان ظہیر فاریابی ۶؍
دیوان غنی کشمیری ۶؍
دیوان ناصر علی ۵؍
دیوان ہلالی ۶؍
کلیات جلال اسیر عہ؍

دواوین اردو

دیوان حسن دہلوی ۶؍
کلیات ظفر ۱۲؍

کلیات مومن عہ؍
دیوان ناسخ ۴؍
کلیات میر ۴؍
کلیات سودا ۴؍
کلیات انشا ۴؍
کلیات نظیر اکبر آبادی عہ؍
گلزار داغ ۴؍
دیوان رند ۹؍
دیوان ذوق ۱۲؍
کلیات اسمعیل ۶؍
مراۃ الغیب عہ؍
صنمخانۂ عشق ۶؍
فریاد داغ ۴؍
دیوان قائل ۸؍
دیوان شہیدی ۴؍

عجائب و غرائب

عجائب المخلوقات تصویر رنگین
" بالتصویر سادہ للعہ
مجمع الفنون مے
طلسم فرنگ ۶؍
کارخانۂ عالم

رسالہ لڑکوں کے ناولوں کے ترجمے

الہ دین ولیلیٰ ۴؍
فریب حسن ۶؍
سوزن عشق عہ؍
روز الیمبرٹ للعہ
ناول اسرار ۶؍
شام جوانی مے
طلسمی فانوس ۱۲؍

نگار بک ایجنسی
نظیر آباد لکھنؤ

تصانیف مولانا نیاز فتحپوری

صحابیات

جس میں عہد سعادت کے ۵۸ خواتین کے مستند حالات درج ہیں۔ اس کا مقدمہ مولانا کی خاص زبان و انشا میں ہے جو دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے

قیمت فی جلد ۶ر

نگارستان

مولانا نیاز کے معجزات ادب و انشا کا انتخاب جس میں بعض وہ فسانے و مضامین بھی درج ہیں جو لٹریچر میں غیر فانی درجہ رکھتے ہیں۔

قیمت فی جلد ۶ر

شاعر کا انجام

مولانا نیاز کے عنوان شباب کا لکھا ہوا ایک افسانہ جس کی ایک ایک لفظ قوت خیال اور زور قلم کا بے مثل نمونہ ہے۔

قیمت فی جلد ۱۰ر

شہاب کی سرگزشت

اردو میں پہلا فسانہ ہے جس میں نفسیاتی تحلیل کے لحاظ سے سیرت نگاری کی گئی ہے۔ یہ امر مسلم ہو چکا ہے کہ اردو میں اس سے بہتر تخیل اور بلند انشا کا فسانہ کوئی شائع نہیں ہوا

قیمت فی جلد عہر

جذبات بھاشا

ہندی شاعری میں جو لوچ اور کیفیت ہے اس کا علم انھیں کو ہو سکتا ہے۔ جنھوں نے اس زبان کی شاعری کا مطالعہ کیا ہے۔ اس کتاب کو دیکھیے اور جذبات و خیال کی پاکیزگی کی داد دیجیے

قیمت فی جلد ۱۲ر

تاریخ الدولتین

جرجی زیدان مصری مشہور مورخ اسلام کی تاریخ تمدن اسلامی کے ایک حصہ کا ترجمہ جس میں عہد بنی امیہ و بنی عباس کی سیاسی تاریخ پر بے مثل تبصرہ کیا گیا ہے۔

قیمت فی جلد عہر

علم فراست الید

یعنی ہات کی لکیروں کو دیکھکر ایک شخص کی سیرت اور اس کے ماضی و مستقبل کے حالات معلوم کرنے کا علم۔ اس فن پر ایک سلسلہ مضامین نگار میں شایع ہوا تھا۔ اب سے خوبصورت جیبی سائز میں مرتب کیا جا رہا ہے اور آخر دسمبر ۱۹۲۸ء تک شایع ہو جائیگا۔ اس کتاب میں اس فن کے تمام مشکلات اسقدر آسان زبان میں حل کیے گئے ہیں کہ ہر شخص مطالعہ کرنے کے بعد نہایت معمولی مشق سے ہات دیکھکر صحیح احکام صادر کر سکتا ہے قیمت فی جلد عہر

ظریف شاعروں کا تذکرہ
یا
تذکرۂ خندۂ گل

اردو فارسی کے جتنے ظریف شاعر گزر چکے ہیں یا اب موجود ہیں ان سب کے حالات مع ان کے لطائف و ظرائف اور نمونہ کلام کے یکجا کر دیئے گئے ہیں۔ یہ کتاب بھی چھپ رہی ہے جو حضرات ابھی سے دو روپیہ بھیجکر اپنا نام درج کرالیں گے ان سے کوئی زاید قیمت نہ لی جائیگی۔ اشاعت کے بعد اسکی قیمت کا اندازہ للعہ کیا گیا ہے۔

خاک پروانہ

مشہور فسانہ نگار منشی پریم چند کے افسانوں کا مجموعہ، جن کی شہرت و قبول کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ چینی زبان میں بھی اسکے ترجمے ہوئے ہیں

قیمت علاوہ محصول عہ

(منیجر "نگار" نظیر آباد لکھنؤ)